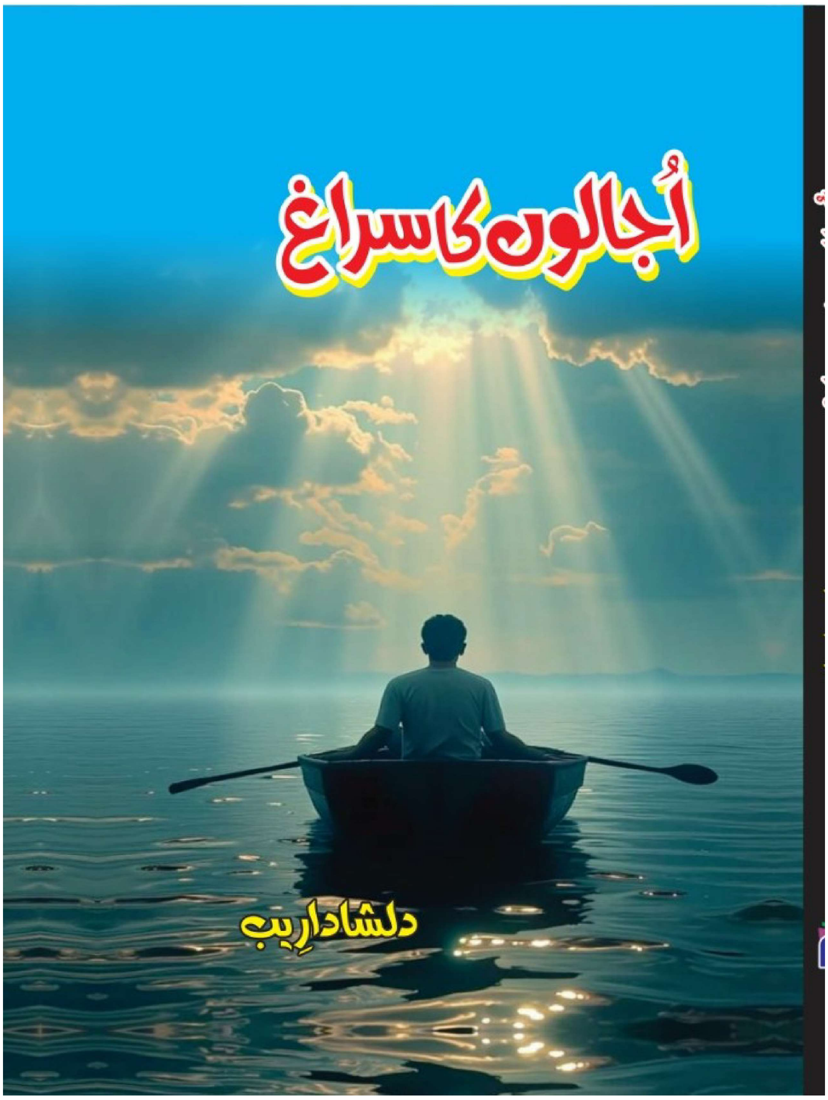
اُجالوں کا سراغ
دلشاد اریب

اُجالوں کا سراغ

دلشاد اریب

طلوع پبلی کیشنز باغ آزاد کشمیر

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ISBN 978-969-7861-03-3

نام کتاب	اُجالوں کا سراغ
مصنف	دلشاد اریب
اشاعت اول	اکتوبر2025ء
سرِ ورق	سیدفہیم گردیزی
اہتمام	میاں عبدالقیوم یوسفی
مطبع	ایوب پرنٹنگ پریس، لاہور
تعداد	500
زرِ بدل	700روپے

طلوع پبلی کیشنز باغ آزاد کشمیر

مکتبہ یوسفیہ

ایوب پرنٹنگ پریس نزد گورنمنٹ آئی ہسپتال داتادربار لاہور

+92 300 8124958 + 92 323 4792670

انتساب

اُس معلم اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام

جن کے نور بصیرت سے دنیا کے ظلمت کدے میں علم وعرفاں کا راج ممکن ہو سکا۔

اُن اساتذہ کے نام

جن کے دم سے حرف اور لفظ کی حرمت باقی ہے اور جن کی تربیت سے مسِ خام کندن بنے

اور جو دنیا بھر کی ساری عزتوں سے بڑھ کر عزت دار ہیں۔

حسنِ ترتیب

☆	دلشادادریب: باغِ ادب میں بادِ بہاری	ڈاکٹر مقصود جعفری	7
☆	اُجالوں کا سراغ	سید شہباز گردیزی	9
☆	دلشادادریب کی خاکہ نگاری کا اسلوب	ڈاکٹر فرہاد احمد فگار	11
☆	کچھ اس کتاب کے بارے میں	دلشادادریب	14
۱۔	مردِ مومن	سید ثناء اللہ شاہ	19
۲۔	ترجمانِ اقبال	پروفیسر عبدالعلیم صدیقی	26
۳۔	باغِ ادب کا باغباں	پروفیسر شفیق راجا	34
۴۔	راجا تھا اپنے من کا	اسلم راجا	42
۵۔	علمدارِ ختم نبوت	میجر سردار محمد ایوب خان	48
۶۔	مردِ آہن Man of Steel	جان محمد (والد محترم)	55
۷۔	بگاہ کا پیر	ڈاکٹر عبدالحسن عاصم	64
۸۔	فخر کھاوڑا	مولوی محمد صادق خان	72
۹۔	نسیمِ سحر	پروفیسر راجا محمد نسیم خان	78
۱۰۔	مولانا صاحب	مولانا عبدالرؤف	88
۱۱۔	حیاتِ سلیم	سردار محمد سلیم خان	93

۱۲۔	ضمیر باضمیر	سید ضمیر حسین گردیزی	101
۱۳۔	سائیں جی	سائیں محمد جاوید خان	107
۱۴۔	عہدِ ناتمام	پروفیسر بشیر عباسی	116
۱۵۔	میٹھے لوگ	سید شہباز گردیزی	123
۱۶۔	سرفراز دھوکا نہیں دیتا	سرفراز احمد	129
۱۷۔	خوش جمال وخوش خصال	کامران حمید بٹ	135
۱۸۔	پپی شوقی بٹیرا	ابرار یونس	141

دلشاداریب: باغِ ادب میں بادِ بہاری

ڈاکٹر مقصود جعفری

میرے لیے یہ امر باعثِ صد مسّرت و مباہات ہے کہ باغ آزاد کشمیر میں آسمانِ ادب پر جگمگاتے ستاروں نے شبِ یلدا کی تاریکی کو کافور کر دیا ہے۔ پونچھ نے جیّد علماء، فضلاء، ادباء اور شعراء کو جنم دیا۔ ادب کی دنیا میں آج بھی پونچھ سے متعلق ادبی شخصیّات کرشن چندر، چراغ حسن حسرت اور تحسین جعفری کی ادبی خدمات تابندہ و پائندہ ہیں۔

''اجالوں کا سُراغ'' دلشاد اریب کی شخصی خاکوں پر مبنی کتاب ہے۔ آپ کا تعلق ضلع باغ آزاد کشمیر سے ہے۔ اس سے قبل آپ کی چار کُتب شائع ہو کر مقبولِ عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ آپ شاعر، استاد، محقق، ادبی نقاد اور کالم نگار ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات لائقِ صد تحسین ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا

مَیں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کا سُراغ

یہ اجالوں کا سراغ ہو یا آتشِ رفتہ کا سُراغ اصل میں یہ مرزا غالب کا طلسمِ گنجینۂ معانی ہے جب وہ کہتے ہیں

گنجینۂ معانی کا طلسم اِسے سمجھیئے
جو لفظ بھی غالب میرے اشعار میں آوئے

دلشاد اریب کے اِن خاکوں میں جو بھی لفظ آیا ہے وہ اُس شخصیّت کا اختصار کے ساتھ فطری اور حقیقی نقشہ

ہے جس کا مبالغہ آرائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ خاکہ نگاری اور سوانح نگاری کا فرق واضح ہے۔ خاکہ نگاری اجمال نگاری ہے جو اختصار کی مُتقضی ہے۔ دلشاد اریب نے ''کُچھ کتاب کے بارے میں'' مضمون لکھ کر خاکہ نگاری کی تاریخ کو اتنی تفصیل سے لکھ دیا ہے کہ اِس موضوع پر مزید لکھنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ آپ نے انگریزی اور اُردو ادب کے قدیم اور جدید خاکہ نگاروں کا تذکرہ کیا ہے جو اُن کے وسیع مطالعے کا غمّاز ہے۔ آپ نے قطرے میں دریائے دجلہ کو بند کر دیا ہے۔ گویا بقول نظیری نیشاپوری

ز فرق تا قدمش ہر کُجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

یہ کتاب گُلدستہ گلہائے صد رنگ ہے۔ اس میں مذہبی، علمی، ادبی اور سماجی شخصیّات کے خاکے ہیں جو نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ میری جنم بُھومی پونچھ میں علم و ادب کے چراغ روشن ہیں اور وہ آج بھی شبِ تیرہ و تاریک میں اجالوں کا سُراغ لگانے میں مشغول ہیں۔ اِن چراغوں میں ایک چراغ دلشاد اریب ہے۔

۱۶ستمبر ۲۰۲۵ء، اسلام آباد

اُجالوں کا سراغ

سید شہباز گردیزی

کسی سیانے نے کہا تھا کہ دنیا میں محبت کی اصل حقدار اشیاء نہیں بلکہ اشخاص ہیں سو اس جملے کا ابلاغ دلشاد اریب پر شخصی خاکہ نگاری کا باعث ٹھہرا۔ موصوف نے اس مجموعے کو مرتب کر کے ثابت کر دیا کہ ان کی زندگی میں اشیاء سے زیادہ اشخاص کی اہمیت ہے۔ انھوں نے اپنے اردگرد سے دو درجن کے لگ بھگ ایسی شخصیات کو چنا جنھوں نے اپنے شخصی وفنی نقوش سے ان کے فکر وخیال میں ارتعاش پیدا کیا۔

پروفیسر شفیق راجا نے کسی نشست میں گفتگو کے دوران اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اگر مجھے کہا جائے کہ میں باغ کو تصویر کسی انسانی شکل میں متشکل کروں تو مجھے یقین ہے کہ جو تصویر کینوس پر ڈرا ہوگی وہ مولانا سید ثناء اللہ شاہ کی ہوگی۔ سو دلشاد اریب نے اس مجموعہ میں جو پہلی تصویر کے نقش واضح کیے وہ اسی شخصیت کے ہیں یعنی باغ کے مجموعی خال وخط کھینچ کر انھوں نے اپنے استاد کا کہا معتبر کر دکھایا۔ انھوں نے شخصی وفنی خاکہ نگاری کے باب میں کھینچی گئی ان صورتوں کے خال وخط کی باریک سے باریک بات کو بھی اپنی ملاقاتوں اور مطالعہ کی بنیاد پر روشن کیا اور معاصر ادب کے کھلے کینوس پر کسی رنگ آمیزی کے بغیر رکھ دیا تاکہ قارئین اس سہولت اور اس تفصیل سے کسب فیض حاصل کر سکیں اور ساتھ ہی کینوس میں چھپے اس آئینے کو بھی دریافت کر سکیں۔

اُجالوں کا سراغ خاکوں اور شخصی مضامین کی حامل ایسی کتاب ہے جس میں مصنف نے اپنے گرد و پیش سے تعلق رکھنے والی چنیدہ شخصیات سے ملاقاتوں کو اپنے مطالعہ اور مطالعہ کو ملاقاتوں سے اثبات، توسیع اور عمیق مہیا کرنے کی سعی کی ہے۔ شخصیت اور علم وفن کی آمیزش سے حفظ مراتب کے پورے احساس ولحاظ کے ساتھ نہایت شائستگی و شگفتگی سے ہر مضمون باندھا گیا ہے جس سے یہ تذکرہ کہانی کے لطف اور انشائیے کی لطافت کا حامل ہو گیا ہے۔

دلشاد اریب کا تنقیدی اسلوب یہ کہ وہ کلمہ خیر کہہ کر ہر اچھی بات، رویہ اور عمل کو فروغ واستحکام دیتے اور کلمہ حق کہہ کر غیر متوازن اور غیر مستحکم احوال وآثار پر گرفت کرتے نظر آتے ہیں۔ اُجالوں کا سراغ کے تذکرے میں دلشاد اریب کی جو اپنی صورت ابھرتی ہے وہ ایک ایسے وضع دار اور دیانت دار شخص کی ہے جو استفادے کا اعتراف اور احسان مندی کا اظہار برسر عام کرنا جانتا ہے۔ ان خاکوں میں بعض اوقات موضوع

سے گریز کی کیفیت بھی ملتی ہے لیکن اس گریز کے عقب میں فکری و شخصی نمود و نمائش کے جذبے کی بجائے احساسات کا دباؤ یا یادوں کا بہاؤ اپنا زور دکھا رہا ہوتا ہے۔ شاید تمام تر علمی و ادبی اختلافات کے باوجود اس بات سے کوئی انکار نہ کرے کہ دلشاد اریب جن خوبیوں کی بنیاد پر کسی کو شخصیت نگاری کے لیے منتخب قرار دیتا ہے وہ خوبیاں خود ان کی اپنی ذات میں موجود ہیں مثلاً درویشی، دیانت داری، راست گوئی، احسان مندی، محسن شناسی، ادب نوازی، کتاب دوستی، محنت شاقہ اور ایک ان تھک تصنیفی و تالیفی سلسلہ جاریہ............شخصیات پر لکھتے ہوئے خود لکھنے والا بھی منکشف ہو جاتا ہے۔

دلشاد اریب نے اس کتاب میں ان شخصیات کو موضوعِ سخن بنایا ہے جن سے خیر، علم و ادب و عرفاں، روحانیت اور فن کی کوئی کرن پھوٹی اور مختلف بطون کو روشن کرتے کرتے ان تک آ پہنچی ہے۔ میں ذاتی طور پر اس بات کا شاہد ہوں کہ کتاب میں موجود تمام شخصیات سے مصنف کا بلواسطہ یا بلاواسطہ ذاتی تعلق رہا ہے۔ مصنف نے صرف خانہ پری کے لیے ایک مخصوص صنف نثر کو موضوع نہیں بنایا بلکہ اپنے عہد کا شخصی خاکہ کھینچ کر اس کے عہد کی واقع نگاری اس میں بھر کے نذر قارئین کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ زیرِ نظر کتاب حلیہ نگاری، کردار نگاری اور منظر نگاری کا حسین امتزاج ہے۔ مردِ آہن، باغِ ادب کا باغباں، سائیں جی ضمیر باضمیر، پپی شوقی بٹیرا، بگاہ کا پیر، سرفراز دھوکا نہیں دے گا اور مردِ مومن خاکہ نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔

یہ کتاب دراصل ان شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات و جرائد میں چھپتے رہے۔ فہرست میں موجود ہر مضمون اپنے اندر مکمل سوانح عمری کے خواص رکھتا ہے۔ دلشاد اریب پیشے کے اعتبار سے استاد ہیں جبکہ تاریخ، دینیات اور اُردو زبان و ادب کے مضامین میں بھی مستند سمجھے جاتے ہیں۔ آپ طویل عرصہ سے آزاد کشمیر کے مختلف کالجوں میں درس و تدریس کے شعبہ سے منسلک ہیں۔ خاکہ نگاری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری، انشائیہ پردازی، کالم نگاری، تاریخ نویسی، تنقید نگاری اور شاعری پر بھی مشقِ سخن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ موصوف زمانہ طالب علمی سے ہی شعبہ تحریر و تحقیق سے وابستہ رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اُجالوں کا سراغ ان کا پانچواں مجموعہ ہے جس کی اشاعت پر مصنف کو ڈھیروں داد کے ساتھ کامیابی، کامرانی اور فراوانیِ سخن کی لاتعداد دعاؤں کا نذرانہ قبول ہو۔

دلشاد اریب کی خاکہ نگاری کا اسلوب

ڈاکٹر فرہاد احمد فگار

خاکہ نگاری اردو ادب کی ایک ایسی لطیف اور باریک صنف ہے جس میں اختصار کے پردے میں کثافتِ معانی پوشیدہ ہوتی ہے اور قلیل الفاظ کے دامن میں ایک کائناتِ معنی سمٹ آتی ہے۔ اس میں محض کسی شخص یا منظر کی صورت گری نہیں کی جاتی بلکہ الفاظ کے جادو سے ایسا تاثر قائم کیا جاتا ہے کہ قاری کے تخیل میں ایک جیتی جاگتی شبیہ مجسم ہو جاتی ہے۔ خاکہ نگار اپنے مشاہدے کی باریک بینی اور بیان کی نفاست کے ذریعے سے کردار کے ظاہر ہی نہیں بلکہ باطن، اس کی نفسیاتی کیفیات، مزاجی افتاد اور اخلاقی رجحانات کو بھی منکشف کرتا ہے۔ جزئیات نگاری کی فنی لطافت معمولی باتوں کو بھی غیر معمولی جمالیاتی رفعت عطا کر دیتی ہے اور زبان کی فصاحت و ندرتِ بیان اس تحریر کو ایک ایسا فن پارہ بنا دیتی ہے جس میں مصوری کی رنگینیاں لفظوں کے پیرایے میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ یوں خاکہ محض بیانیہ نہیں بلکہ ایک لسانی مرقع ہے جو قرطاس کو کینوس اور قلم کو رنگوں کی صورت اختیار کرا دیتا ہے۔

اس تعریف کی روشنی میں جب ہم دلشاد اریب کے خاکوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دلشاد اریب کے خاکوں میں اسلوب کی سادگی، اثر آفرینی اور جزئیات نگاری قاری کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ وہ اپنے خاکوں میں فرد کے ساتھ ساتھ معاشرت اور تاریخ کو بھی بڑی خوب صورتی سے اجاگر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر خاکہ محض شخصیت نگاری نہیں رہتا بلکہ ایک تہذیبی و سماجی دستاویز بن جاتا ہے۔

ان کے مجموعے "اُجالوں کا سراغ" میں اٹھارہ خاکے شامل ہیں جو مختلف ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔ یہ خاکے محض شخصی تعارف نہیں بلکہ اپنے اندر ایک دور، ایک فضا اور ایک معاشرتی پس منظر بھی سموئے ہوئے ہیں۔ ان کے خاکے پڑھتے ہوئے قاری کبھی فرد کے کردار میں جھانکتا ہے تو کبھی معاشرتی اور تاریخی شعور کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

ان کا خاکہ "مردِ مومن" اس کی عمدہ مثال ہے جس میں باغ شہر کی مذہبی تاریخ بھی سامنے آتی ہے۔ وہ لکھتے

ہیں:

"ایسے میں لگ بھگ 1925ء کے عرصہ میں باغ میں آبادی بڑھتی چلی گئی اور ایک دینی مرکز کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس مقصد کے لیے ایک قطعہ اراضی نیک مقصد کے لیے وقف کیا گیا اور یوں مسجد کی تعمیر کی ابتدا ہوئی۔"

یہ اقتباس اس بات کا ثبوت ہے کہ دلشاد اریب کردار کے ساتھ ساتھ سماج کی تاریخ کو بھی قلم بند کرتے ہیں اور یوں قاری کو ماضی کی جھلک دکھلاتے ہیں۔ ان کے خاکوں میں اسلوب کی سادگی اور اثر آفرینی کا یہ امتزاج قاری کے دل پر دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔

دلشاد اریب کے ہاں مذہب اور ادب کی آمیزش بھی نہایت دل کش ہے۔ ان کا خاکہ "باغ ادب کا باغبان: شفیق راجا" دیکھیے جہاں وہ ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"وہ محفلوں میں شوقیہ نعت خوانی کرتے، کبھی مشاعروں میں نعتیہ کلام سناتے اور کبھی کلاس روم میں بچوں کو سیرت نبوی ﷺ کے واقعات سنا کر محبتِ رسول ﷺ سے سرشار کر دیتے۔"

یہ جملے اس بات کے غماز ہیں کہ دلشاد اریب شخصیت کے ظاہری خدوخال کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی اور فکری جہت کو بھی اجاگر کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔

دلشاد اریب کے خاکوں میں لطیف مزاح کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ ان کا خاکہ "راجا تھا اپنے من کا" اس پہلو کو ظاہر کرتا ہے:

"خیال آیا کہ اگر یہی وادی ہے وہ وادی جہاں رخسانہ رہتی ہے تو اس رخسانہ کا "رخسان" اسلم راجا کہاں رہتا ہے۔"

اسی طرح اسی خاکے میں وہ ایک اور دلکش جملہ لاتے ہیں جو قاری کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے:

"عذرا رخسانہ کا نام آتا تو ہم سب آنکھوں اور دل میں خود بہ خود جھانکنے لگتے کہ عذرا رخسانہ کہاں ہے"...

یہ ہلکا پھلکا مزاح قاری کو محظوظ کرتا ہے مگر اس میں تمسخر یا طنز کا شائبہ نہیں ملتا بلکہ کردار کی معصومیت اور طلبہ کی شوخ طبیعت کا عکس جھلکتا ہے۔یہی ان کے مزاح کو لطیف اور خوشگوار بناتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو دلشاد اریب کی خاکہ نگاری اپنے اندر کئی جہات رکھتی ہے۔وہ فرد کو سماج اور تاریخ کے دھارے میں رکھ کر دکھاتے ہیں۔ان کا اسلوب سادہ مگر دل نشین ہے،زبان میں شگفتگی ہے،منظر نگاری میں وضاحت اور بیان میں اثر پذیری ہے۔ان کے ہاں تاریخ کے تذکرے،مذہبی وتہذیبی جھلکیاں اور لطیف مزاح سب ایک ساتھ مل کر ایک ایسا انفرادی اسلوب تشکیل دیتے ہیں جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔"اجالوں کا سراغ" بہ جا طور پر ان کے فکر وفن کی روشنی کا مظہر ہے۔

☆☆☆

کچھ اس کتاب کے بارے میں

جس طرح شاعری میں کسی شعر کے دو مصرعے اگر ہم وزن نہ ہوں تو اچھا خاصا شعر بھی طبعیت پر گراں گزرتا ہے اسی طرح کسی شخص کی سوانح عمری مرتب کرتے ہوئے سوانحی خاکے میں شوخ رنگوں کی ذرا سی زیادتی یا گلکاری سے شخصیت کے اصل خدوخال دب جاتے ہیں اور قاری کے سامنے بشر کی بجائے کسی دیو مالائی ہیرو یا ایلین کی تصویر ابھرتی ہے جو انسان کم اور فرشتہ زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ اس کے برعکس خاکہ نگار اگر خاکے میں رنگ بھرتے ہوئے کسی بھی طرح کی کم آمیزی کا شکار ہو جائے تو وہ خدوخال اتنے غیر واضح ہو جاتے ہیں جو شخصیت کے عکس کو نمایاں نہیں ہونے دیتے۔

خاکہ نگاری کی صنف اپنے اندر بڑی وسعت اور جامعیت رکھتی ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے خاکہ نگاری کسی شخصیت کی اس طرح تحریری عکاسی کرنا ہے جس میں اس شخصیت کی ظاہری منظر کشی کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کا بھی احاطہ کیا جا سکے۔ اس کے لیے انگریزی میں Sketch اور فنِ مصوری میں اس سے ملتی ایک اصطلاح Portrait استعمال ہوتی ہے جس میں کسی شخص کی ہو بہو تصویر بنائی جاتی ہے۔

خاکہ نگاری، سوانح اور خودنوشت سوانح نگاری سے مختلف صنف ادب ہے۔ سوانح نگاری اور خودنوشت میں کسی شخص کی زندگی کے حالات یا واقعات کو سوانح نگار تفصیل سے بیان کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس خاکے میں اس شخص کی زندگی اور شخصیت کے چند انوکھے یا دلچسپ پہلوؤں کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس شخص کی زندہ تصویر سامنے آنے لگتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سوانح عمری میں خاکے کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن خاکے میں سوانح عمری نہیں سما سکتی۔

خاکہ نگاری کا آغاز انگریزی ادب سے ہوا اور ملٹن مرے (Milton Murray)، لٹن اسٹریچی (Lytton Straychey) اور انتھونی اشیلی کوپر (Anthony Ashley Cooper) کو ابتدائی خاکہ نگاروں کی حیثیت سے شہرت اور انفرادیت حاصل ہوئی۔ اُردو ادب میں اس کا آغاز 20ویں صدی میں ہوا اور اس کا شمار جدید اصناف ادب میں کیا جاتا ہے۔

اُردو ادب میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے سے ہوتا ہے جبکہ اس کے ابتدائی نقوش اُردو شعرا کے تذکروں میں بھی نظر آتے ہیں جیسے میرؔ کا تذکرہ "نکات الشعرا"، مصحفی کا "تذکرہ ہندی" اور شیفتہ کا " گلشن بیخار" وغیرہ جن میں خاکے کے نقوش نمایاں ہیں۔ محمد حسین آزاد کی کتاب " آب حیات" اور " دربارا کبری" اور انشاء کی "دریائے لطافت" نیز عبدالحلیم شرر، مولوی نذیر احمد، رسوؔا اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں بھی خاکے کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریا آبادی اور محمد علی جوہر وغیرہ نے خاکہ نگاری کی راویت میں حصہ لیا اور خوبصورت اور دلکش خاکے تحریر کیے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے خاکوں میں ظرافت کا پہلو اختیار کیا جو کہ ان کے دیگر نثری اصناف کی بھی خصوصیت ہے۔ ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ 'گنج ہائے گراں مایہ' ہے اور دوسرا مجموعہ 'ہم نفسان رفتہ' ہے۔ ان کے علاوہ محمد علی جوہر نے بھی بہترین خاکے لکھے۔

خاکہ نگاری کی اس تاریخ میں عصمت چغتائی، خواجہ حسن نظامی اور منٹو کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ عصمت چغتائی نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر "دوزخی" کے نام سے خاکہ لکھا جو بے حد مقبول ہوا۔ خواجہ حسن نظامی نے اس فن کو شوخی و ظرافت کے ذریعہ دلچسپ بنایا۔ سعادت حسن منٹو نے بھی جداگانہ اسلوب و انداز میں خاکے لکھ کر اس روایت کو نیا رنگ عطا کیا۔ گنجے فرشتے، لاؤڈ اسپیکر اور فلمی شخصیتیں ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں جن میں وہ اپنے خاکوں کے ذریعے انسانوں کی جانچ پرکھ کرتے ہیں۔ شوکت تھانوی، مشتاق احمد یوسفی، کنھیا لال کپور، شورش کاشمیری، فکر تونسوی، کرشن چندر، احمد بشیر اور قرۃ العین حیدر وغیرہ نے بھی عمدہ خاکے لکھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے ادیبوں نے خاکے لکھے اور آج بھی لکھے جا رہے ہیں جس سے اس صنف کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔

خاکہ نگاری کے لیے قطعاً یہ ضروری نہیں کہ کسی بڑی یا کسی ادبی شخصیت کا خاکہ ہی تحریر کیا جا سکتا ہے عام آدمی کا نہیں۔ خاکے کا تعلق خاکہ نگار کے مشاہدے، مطالعے اور اندازِ تحریر سے ہے کہ وہ کس طرح کسی عام سے آدمی کا بہت ہی آفاقی خاکہ تحریر کرے جیسے مولوی عبدالحق کا خاکہ ''نام دیو مالی'' ہے جو خاکہ نگاری میں باقاعدہ کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔

مختصراً یہ کہ شخصیات کے متعلق لکھنا اور بالخصوص ایسی شخصیات کے سوانحی خاکے تحریر کرنا جن سے یک جہتی کے مقابلے میں کثیر الجہتی تعلق رہا ہو اور ان کو اس طرح سے ترتیب دینا کہ بلاکم و کاست ہر پہلو بیان ہو سکے گویا دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہے جس پر ذرا سی قصیدہ گوئی سے شخصیت پرستی کا گمان گزرتا ہے اور اعتراف خدمات میں ذرا سے بخل سے حرمت قلم پر حرف آتا ہے۔ ان سب احباب کی شخصیات پر قلم اُٹھانا اور ''اُجالوں کا سراغ'' کے عنوان سے پوری ایک کتاب مکمل کر لینا اور وہ بھی اس طرح کے بغیر کسی لگی لپٹی کے جو ہے جیسے ہے کی بنیاد پر زیور قرطاس کرنا جان جوکھوں کا کام تھا جسے میں نے کوشش کر کے اس طرح نبھایا ہے کہ پڑھنے والا جب ان شخصیات کے خاکوں کے مطالعہ سے گزرے تو اس کے ذہن میں ہو بہو وہی عکس قائم ہو جو وہ عام زندگی میں موجود تھا اور جس کا مشاہدہ اور گواہ خود وہ قاری بھی رہا ہو۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے آپ کو کسی مافوق الفطرت ہیرو کا تصور ذہن میں جاگزیں نہیں ہوگا بلکہ ایک عام گوشت پوست کا انسان جو جس حیثیت سے دنیا میں رہا اور جتنا اس کی شخصیت کا کردار تھا اس کو نبھا کر رخصت ہوا ویسا ہی دکھائی دے گا۔ خاکہ نما یہ تحریریں کسی ایک بھی شخصیت کی مکمل سوانح نہیں ہے نہ ہی ان شخصیات کے خاکے مرتب کرتے ہوئے مضمون طرز کی معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے برعکس ان کی شخصیت کے وہ ہلکے سے خدوخال کھینچے گئے ہیں جن سے قاری کے ذہن میں دوران مطالعہ وہ عکس واضح ہو سکے جن سے اس شخصیت کی پہچان ہو سکے۔

جن شخصیات کے خاکے تحریر کیے گئے ہیں ان کا انتخاب کرتے ہوئے کوئی خاص طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ یہ سارے کے سارے ان شخصیات کے خاکے ہیں جن سے مختلف سطحوں پر بلا تخصیص ان کے کسی ظاہری عہدے یا مرتبے اور مقام کے بس جہاں ہے جیسا ہے کی بنیاد پر تعلق اور وابستگی رہی ہے اور یہ تحریریں وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات، جرائد اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر شائع ہوتی رہی ہیں۔ اب یہ سب تحریریں یکجا ہو کر اُجالوں کا سراغ بن کر آپ کے ہاتھوں میں ہیں جن سے آپ ان شخصیات کے مختلف پہلوؤں کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

اس کتاب کے اس نام کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہر شخص اپنی ذات اور ان سے وابستہ لوگوں کے لیے خود

کو جلا کر ان کی زندگیاں اُجالتا ہے اور اس ساری چکا چوند میں خود کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ کتاب ان چند شخصیات اور ان ہی اُجالوں کے سراغ کی ایک کوشش ہے۔ ان خاکوں کی تکمیل اور صحیح معنوں میں ادبی رنگ بھرنے میں کس حد تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ تو آپ کے ذوق مطالعہ سے ہو گا۔ کتاب کی تدوین ،مشاورت اور تکمیل میں پروفیسر شفیق راجا، سید شہباز گردیزی، بشارت تنشیط، ڈاکٹر فرہاد احمد فگار، زبیر حسن زبیری، سید مشتاق بخاری، ابرار یونس، سردار شعیب، ڈاکٹر ریاض عباسی اور دیگر جن احباب کا ساتھ اور معاونت رہی ہے ان سب کی بلندی اقبال کے لیے دلی طور پر دعا گو ہوں۔ اسی طرح اپنی نصف بہتر اور باذان اریب، محمد، حورین اور منتہیٰ کا بھی دل سے احسان مند ہوں کہ ان کے حصے کا بہت سا وقت بھی اس کام کی تکمیل میں صرف ہو گیا۔

ایک ایسے وقت میں جب کتب بینی کی روایت ہر گزرتے دن کے ساتھ معدوم ہو رہی ہے، جب کارِ روزگار نے انسان کو اس کی ذات کی حد تک محدود کر دیا ہے، جب نفسا نفسی اور اس دور کشا کش میں ہر شخص دوسرے سے بغض، نفرت اور کینہ رکھے ہوئے ہے جب آرٹیفیشل انٹیلیجنس AI اور سوشل میڈیا کی بھرمار میں انسان سمٹتے سمٹتے موبائل اور گیجٹس کی سکرین تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اپنی ذات میں اس حد تک تنہائی کا شکار ہے کہ اسے اپنے غم و خوشی کو بانٹنے کے لیے بھی دوسرا کوئی میسر نہیں۔ ایسے میں ہمارے پاس مال غنیمت کے طور پر چند وہ احباب ہیں جو دن بھر کی مصروفیات کے بعد شام کے چند پل مل بیٹھتے ہیں۔ یہ سارے کے سارے وہ دوست ہیں جو مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ ہیں اور مختلف عہدوں پر اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں مگر جب وہ یہاں آ کر بیٹھتے ہیں تو ان ساتھ بیٹھنے والوں میں اس وقت کوئی شاہ نہیں ہوتا نہ کوئی گدا......سب اپنی اپنی تھکن کاندھوں پر لادے جمع ہوتے ہیں اور کچھ پل گزار کر سب تھکن اتار کر واپس اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ بقول انشاء

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

اور بقول جاوید احمد

چند شاعر ہیں جو اس شہر میں مل بیٹھتے ہیں

ورنہ لوگوں میں وہ نفرت ہے کہ دل بیٹھتے ہیں

باقی جہاں تک بات رہی اُجالوں کا سراغ کی تو یہ کتاب آپ کی تنہائی کو بانٹنے میں بھی معاون ہو گی ،آپ کے ذوق مطالعہ کو بھی جلا بخشے گی اور آپ کو ان شخصیات کے ان گوشوں سے بھی ملوائے گی جو کبھی آپ کی آنکھ سے اوجھل تھے۔اس لیے خوب ذوق وشوق سے اس کا مطالعہ کیجیے،آپ کے حاصل مطالعہ اور مثبت آرا کا انتظار رہے گا۔

راجادلشاد اریب

باغ آزاد کشمیر

03335736140

۱۰ اکتوبر ۲۰۲۵ء

مردِ مومن

وہ بظاہر عام سی وضع قطع کے آدمی تھے، درمیانی قد وقامت، جسمانی طور پر نہ بہت موٹے کہ موٹاپا ان کی شخصیت کا عیب دکھائی دے اور نہ ہی ایسے نحیف ونزار کہ اصل شخصیت ہی پس منظر میں چلی جائے۔ اس کے برعکس عموماً کرتہ اور شلوار میں ملبوس، چہرہ سفید ریش، رنگ گندمی مائل، سر پر بڑا سا رومال جسے بوقت ضرورت پگڑی اور عمامہ کی شکل دے لیتے تھے۔ درمیانی چال یہ ساری چیزیں مل کر ان کی شخصیت کو دیکھنے اور ملنے والوں کے لیے ایسا دلکش بناتی کہ خود بخود دوسروں کے دلوں میں گھر کر جاتے۔ پروفیسر شفیق راجا نے بجا طور پر ہی کہا تھا کہ اگر مجھے اس شہر باغ کو مجسم کرنا پڑے تو بجا طور پر جو تصویر بنے گی وہ پیر سید ثناء اللہ شاہ کی ہو گی۔

میں نے جب پہلی بار ان کو دیکھا تو ان کے بارے میں پہلا تاثر ہی محبت اور عقیدت کا تھا اور جب ان سے شرف باریابی ہوا تو ان کو سراپا عجز ومحبت کے طور پر پایا۔ یہ ان کی ذات میں پائی جانے والی فطری کشش تھی جو اپنے بیگانے سب کو کھینچ کر ان کے اس مرکز کے ساتھ جوڑتی تھی اور جو ایک بار ان کی ذات کے اس جوہر سے مستفید ہو لیتا وہ جہاں بھی ہوتا لوٹ کر واپس خود کو وہیں لاتا۔ ان کی ذات ہر طرح کے تصنع و بناوٹ سے پاک تھی نہ ہی کسی طرح کے ایسے زعم میں مبتلا تھی جو آدمی ہوتے ہوئے ہم میں سے ہر ایک میں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی سطح پر پائی جاتی ہے۔ ان کا زیادہ تر وقت مسجد اور مسجد سے نکل کر مسجد سے متصل حجرے یا پھر مدرسہ نصرت الاسلام میں موجود طلبہ کی تربیت اور نگہداشت اور نگرانی میں گزرتا۔

مسجد ہو یا ان کا حجرہ مجلسی تکلف سے کوسوں دور رہتے ہوئے آنے والے ہر ایک زائر اور مہمان کو یکساں احترام دینا، ہر ایک کی بات غور سے سننا اور اس کی بات کا جواب دینا، خلاف شرع امور پر فوراً ٹوک اور

روک دینا اور حق بات پر کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لانا ان کی شخصیت کا وہ وصف تھا جو ان کی زندگی میں آخر وقت تک یوں ہی قائم ودائم رہا۔اپنے مواعظ وخطبات میں ہمیشہ اصلاح معاشرہ پر توجہ دیتے ،صرف یہی نہیں بلکہ اس کے لیے اصلاح معاشرہ کے نام سے باقاعدہ فورم قائم کر کے اس کے توسط سے الگ سے بھی اصلاح معاشرہ کے لیے کوشاں رہتے ۔فتنہ قادیانیت کے حوالے سے اپنے بھر پور موقف پر قائم رہے اور اس کے تدارک کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔

ایک عرصہ سے محسوس وغیر محسوس طریقے سے قبیلائی ،لسانی اور مسلکی افراط وتفریط کے بڑھتے ہوئے ماحول میں خود کو اور اس مرکزی روحانی ادارے کو سب کے لیے یکساں رکھنا کوئی معمولی بات نہیں تھی مگر آفرین ہے کہ وہ اس منبر رسول پر بیٹھ کر اس کی غیر جانبداری قائم رکھنے میں ہمیشہ کوشاں رہے اور اس میں کامیاب بھی رہے جس کی وجہ سے اپنے بیگانے سب اس مرکز کا احترام کرتے اور اس مرکز کی خدمات کے معترف رہے۔ان کی علمی وروحانی میراث کا یہ وہ فیض تھا جو پورے زور وشور سے گزشتہ لگ بھگ ایک صدی سے جاری وساری ہے اور روزانہ سینکڑوں لوگ اس اہم دینی مرکز سے اکتساب کرتے ہیں۔

میں چشم تصور میں جب اس وقت کو لاتا اور اس مرکز کی ابتدا اور قیام کے بارے میں سوچتا اور تاریخ کی اوراق گردانی کرتا ہوں تو سب کچھ ایک فلم کی طرح پردہ ذہن پر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔آج سے لگ بھگ ایک صدی قبل کا منظر نامہ جب یہ سارا خطہ ڈوگرہ راج میں گرا ہوا تھا اور اس سارے باغ شہر میں مسجد نام کی کوئی ایسی جگہ موجود نہیں تھی جہاں مسلمان اپنے مذہبی دینی فریضے سے مستفید ہو سکتے ۔ایسے میں اول اول باغ شہر کی قدیمی مسجد ہونے کا اعزاز مسجد بلال (موجودہ عقب دیوان عزیز ہوٹل) کو حاصل ہوا۔اس کے باوجود یہ کوئی ایسا مرکز نہ بن سکی جو شہر بھر کے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرتی۔

ایسے میں لگ بھگ 1925 کے عرصہ میں باغ شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورت کے پیش نظر سردار سکندر خان صدر انجمن اسلامیہ باغ (چچا جان پروفیسر شفیق راجہ)،سید بہادر علی شاہ (پدر سیداں)،اور صلاح محمد (گھڑی ساز کلس والے) آپس میں مل بیٹھے اور باہم مشاورت سے یہ فیصلہ کیا کہ باغ شہر میں مسلمان آبادی کے لیے مسجد کی تعمیر وقت کی اہم ضرورت ہے۔مسجد کے لیے مناسب مقام اور جگہ کے حوالے

سے کافی غور وحوض کیا گیا۔اس سارے غور وحوض کے نتیجے میں سردار سکندر خان نے اپنی ملکیتی اراضی (متصل موجودہ زمان چوک) میں سے ایک قطعہ ارضی اس نیک مقصد کے لیے وقف کی اور یوں مسجد کی تعمیر کے لیے ابتدائی کام کا آغاز کرتے ہوئے بغیر کسی تاخیر کے ایک تھڑا تعمیر کر کے تھوڑی سی کوشش سے کچی مسجد کی تعمیر کر لی ۔سید بہادر شاہ کو اس مسجد میں پہلی اذان دینے اور پیر سید سوار شاہ کو پہلی با جماعت نماز پڑھانے کا اعزاز حاصل ہوا۔

مسجد کی تعمیر سے شہر میں موجود اکثریتی غیر مسلم آبادی نے اسے اپنے مذہبی معاملات میں مداخلت گردانتے ہوئے رکوانے کی کوشش کی۔ان کا خیال تھا کہ یہ مسجد چونکہ بلند جگہ پر واقع ہے اور بارشوں کے دوران اس مسجد سے بہنے والا پانی ان کے رام مندر اور کنویں (موجودہ مدرسہ تعلیم القرآن باغ) کو ناپاک کرے گا لہذا اسے ہر ممکن روکا جائے۔اس کام کو روکنے کے لیے ہندو آبادی نے ہر طریقہ آزمایا۔ یہاں تک کے قانونی تعطل پیدا کرنے کے لیے دفتر تحصیلدار باغ سے حکم امتناعی حاصل کر کے وقتی طور پر مسجد کی مزید تعمیر کو روک دیا گیا۔ جب یہ خبر عام ہوئی تو اس سے مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی چنانچہ اس حکم امتناعی کو ختم کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دی گئیں۔

باغ کے متمول تاجروں خواجہ تقی جو، خواجہ اکبر علی، خواجہ حسن جُو ، خواجہ عبداللہ جو اور دیگر نے قانونی مدد حاصل کرنے کے لیے اخراجات اپنے ذمہ لیے اور پونچھ کی ڈسٹرکٹ کورٹ لاہور میں کیس کیا گیا۔کئی مہینوں تک کیس کی سماعت ہوتی رہی جس کی پیروی کرنے کے لیے باغ سے سردار سکندر خان اور دیگر مختلف اوقات میں اس کیس کے حوالے سے عدالت کے سامنے پیش ہوتے رہے۔ جب اس عدالتی کارروائی کا مہاراجہ پونچھ کو علم ہوا تو اس کی ذاتی دلچسپی سے یہ حکم امتناعی خارج ہوا۔ یہی نہیں بلکہ خیر سگالی کے طور پر مہاراجہ نے اپنی ذاتی جیب سے مسجد کی تعمیر کے لیے پانچ سو روپے عطیہ دیا۔ یوں قانونی پیچیدگی ختم ہونے کے بعد اس مسجد کی تعمیر مکمل کی گئی اور اسے نمازیوں کے لیے باقاعدہ طور پر کھول دیا گیا۔

یہاں تک تو بات ٹھیک تھی مگر اب اس مرکز کو چلانے کے لیے کسی ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو اس ظلمت کدے میں نور ایمان کی کرنیں بکھیر سکے۔شہر میں بسنے والی اکثریتی غیر مسلم آبادی کے مقابلے میں

اسلام کی تعلیمات کی روشنی کو پھیلا سکے اور ہر طرح کے باطل کا مقابلہ کر سکے۔قدرت نے اس کے لیے جس شخصیت کا اور جس طرح انتخاب کر رکھا تھا وہ سب سے اوجھل اور خاموشی سے مرکزِعلم وعرفان ازہر الہند دارالعلوم دیوبند جیسی علمی ذرخیز سرزمین پر مولانا سید حسین احمد مدنی،مولانا شبیر احمد عثمانی،مولانا انور شاہ کشمیری، مفتی محمد شفیع اوران جیسے دیگر چوٹی کے علماء واساتذہ کی زیرنگرانی شریعت وسلوک کی تمام منازل ایک ایک کر کے طے کر رہی تھی۔ان علوم میں تفسیر،حدیث،فقہ،اصول الفقہ،منطق،فلسفہ،نحو بھی تھےاور دیگر ظاہری و باطنی علوم بھی۔

یوں تعلیم کی تکمیل کے بعد جنگ عظیم دوم سے ایک سال قبل ان کی اگلی منزل مرکزی جامع مسجد ٹھہری اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک لگ بھگ چونسٹھ سال جاری وساری رہا۔حالانکہ اس کے برعکس ان کے اساتذہ اور رفقاء کا یہ خیال تھا کہ وہ دارالعلوم دیوبند میں ہی اپنی علمی خدمات جاری رکھیں۔ان کو باغ میں لانے اور اس بڑے دینی مرکز کے ساتھ وابستہ کرنے میں ان کے چند قریبی رفقاء کا بھی کلیدی کردار رہا۔ان کا خیال تھا کہ اس دینی مرکز کی قیادت کسی ایسے جید عالم دین کے پاس ہو جو ایک طرف کفر اور الحاد کے ماحول میں اسلامی شریعت کا تصور واضح کر سکیں اور دوسرے بدلتے ہوئے برصغیر کے سیاسی منظرنامے میں قوم کی درست خطوط پر راہنمائی کر سکیں۔

پیر سید ثناءاللہ شاہ کے مرکزی جامع مسجد باغ کے ساتھ وابستگی کے تھوڑے ہی عرصہ میں برصغیر کے حالات میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں۔ان تبدیلیوں کے محرکات میں جہاں ایک طرف جنگ عظیم دوم کے ردعمل میں برطانیہ اور بالخصوص کشمیر میں ڈوگرہ راج کی کمزور ہوتی ہوئی گرفت تھی وہیں دوسری طرف مسلمانان برصغیر اور مسلمانان کشمیر میں جدوجہد آزادی کی چنگاری شعلہ بننے کو بےتاب تھی۔اس وقت کی تحصیل باغ میں بھی اس تحریک کے اثرات ہر گزرتے دن کے ساتھ نمایاں ہو رہے تھے۔یہاں اس تحریک کو منظم کرنے اور آگے بڑھانے والوں میں پیر علی اصغر شاہ گیلانی،مفتی امیر عالم،پیر سید شمشاد شاہ سوہاوی،پیر سید کبیر شاہ سوہاوی،مولانا سید مظفر حسین مدنی،مولانا عبداللہ کفل گڑھی،سید حسن شاہ گردیزی اور ان کے ساتھ دیگر سیاسی زعما پیش پیش تھے۔

باغ شہر کے مرکز میں موجود سید ثناء اللہ شاہ اس تحریک میں ان کے دست راست تھے۔ تحریک آزادی کے دوران باغ کو یہ انفرادیت حاصل رہی کہ یہاں سیاسی اور عسکری تحریک کو منظّم کرنے اور آگے بڑھانے والے زیادہ تر علماء اور مسجد و منبر سے وابستہ شخصیات رہیں۔ یہ انہی زعماء کی سیاسی بصیرت اور عسکری جدو جہد کا نتیجہ تھا کہ آنے والے عرصہ میں ڈوگرہ سامراج کو یہاں سے اپنا بوریا بستر گول کرنا پڑا اور نہ صرف باغ بلکہ ریاست جموں کشمیر کا 5134 مربع میل پر مشتمل علاقہ آزاد ہوا جو آج آزاد کشمیر کہلاتا ہے۔

سید ثناء اللہ کا شمار ان جید ہستیوں میں کیا جاتا ہے جنہوں نے اپنی ساری زندگی توکل اور غنا میں گزار دی۔ ہمارے ہاں خال خال ایسے لوگ دکھائی دیتے ہیں جو ہر طرح کی ریاکاری سے پاک ہوں۔ جن کا اوڑھنا بچھونا صرف اور صرف رب کی رضا ہو۔ سید ثناء اللہ شاہ کے بارے میں کون کہہ سکتا تھا کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب ان کی شخصیت اور ان سے منسوب مرکز مرجع خلائق ہوگا اور سید ثناء اللہ شاہ کی اس کے حوالے سے مرکزی حیثیت ہوگی۔ فطرت خود کرتی ہے لالے کی حنا بندی کے مصداق فطرت نے ان کے لیے خود وہ تمام راستے ہموار کیے جن سے گزر کر آپ باغ میں ہر خاص و عام کے لیے باعث خیر ہوئے۔

سید ثناء اللہ شاہ کی سرپرستی میں مرکزی جامع مسجد باغ نے نہ صرف دینی فہم و بصیرت کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا، ان کے مواعظات حسنہ اور دعوت و ارشاد سے عوام الناس کے قلوب و اذہان معطر ہوئے بلکہ نصف صدی سے زائد تک بغیر کسی مسلکی اور گروہی انتشار کے یہ مذہبی ادارہ دینی وحدت کی علامت رہا۔ اس کا سہرا بلا مبالغہ سید ثناء اللہ شاہ کی بصیرت اور وسعت نظری کو جاتا ہے۔ اس کے برعکس بعد کے حالات میں یہ ماحول ویسا نہ رہا جیسا ان کی موجودگی میں تھا۔ آج کے شہر کے منظر نامے میں شہری حدود میں دو درجن سے زائد جامع مساجد اور دینی مدارس قائم ہیں جو اپنی اپنی سطح پر دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور ان کی اہمیت سے انکار نہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ غیر محسوس طریقے سے ان مراکز کو خالص للّٰہیت کی بجائے قبیلائی، لسانی، مسلکی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم کر کے دین سے زیادہ اپنی اس وجہ کو فوقیت دی گئی ہے جس کی بنیاد پر ان کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس کے برعکس جب مرکزی جامع مسجد باغ کی خدمات پر نگاہ پڑتی ہے تو اس کے پیچھے کارفرماں وہ جذبہ جس کے تحت اس کو قائم کیا گیا واضح نظر آتا ہے۔ اس مسجد میں نصف صدی سے زائد کی

وہ دینی خدمات جو سید ثناء اللہ شاہ کی ذات سے قدرت نے لیں ان کا فیضان غیر محسوس طریقے سے ہر نمازی اور زائر یہاں آکر محسوس کرتا ہے۔

اس مسجد کے ساتھ متصل مدرسہ جامعہ عربیہ نصرت الاسلام جس میں تشنگان علم حفظ، تجوید اور کتب کے حوالے سے اپنے شوق کی آبیاری کرتے ہیں تسلسل سے علوم دینی اور باطنی کا فیض تقسیم کر رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں مزید اضافہ کیا گیا ہے اور مدرسہ احسن العلوم للبنات کے نام سے طالبات کی تعلیم و تربیت کا بھی بندوبست کیا گیا ہے جہاں ان کو دینی اور جدید علوم دیے جاتے ہیں۔ شب و روز اس مرکز سے قال اللہ تعالیٰ اور قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائیں قلوب و اذہان کو معطر کر رہی ہوتی ہیں۔ یہ یقیناً وہ فیضان ہے جو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہو رہا ہے۔

جب ہم شریعت اور طریقت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ دونوں دین کی وہ دو بنیادی جزیات ہیں جس سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا۔ انسانی زندگی کے وہ اعمال جن کا تعلق انسان کے ظاہر سے ہے وہ شریعت کے دائرے میں آتے ہیں اور شریعت اور فقہ کہلاتے ہیں جبکہ وہ اعمال جن کا تعلق انسان کے باطن سے وہ طریقت و تصوف میں شمار ہوتے ہیں۔ گویا شریعت دین کی اصطلاح میں جسم اور طریقت اس کی روح کا نام ہے۔ قرآن اگر ایک طرف عبادات، معاملات اور معاشرت کے آداب کا حکم دیتا ہے اور ان کو بجا لینے کی تلقین کرتا ہے تو وہیں قد افلح من تزکی اور اس جیسی دیگر اصطلاحات کے ساتھ باطنی اصلاح پر بھی زور دیتا ہے۔ آج معاشرے میں افراط و تفریط کے اس دور میں ایک طبقہ صرف شریعت کی بات کر کے طریقت کا رد کرتا ہے جبکہ دوسرا طریقت پر زور دیتے ہوئے شریعت کی کھلم کھلا خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ ایسے میں سید ثناء اللہ شاہ نے شریعت پر مکمل کاربند رہتے ہوئے طریقت کو عملاً نافذ کر کے دکھایا۔ اس کا ثبوت گزشتہ کئی عشروں پر محیط وہ روحانی، تربیتی اور تبلیغی مساعی ہیں جو اس مرکز سے شب و روز جاری ہیں اور قال اللہ تعالیٰ و قال رسول اللہ کی صدائیں ہر آن یہاں سے بلند ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ذاتی زندگی میں بھی بہت کم گو اور شعلہ بیان مقرر سے کہیں زیادہ دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے۔ منبر پر دوران گفتگو انداز اتنا سادہ سلیس اور دلنشیں ہوتا کہ ایک ایک بات سننے والے کے دل میں اترتی اور عمل کا حصہ

بنتی چلی جاتی۔ بازار میں بہت کم نکلا کرتے تھے اور اگر کبھی بعد از نماز عصر نکلیں تو کوئی آدمی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ظاہر کے لبادے میں جو شخص محو سفر یا محو گفتگو ہے وہ باطن میں کتنے اسرار لیے ہوئے ہے۔ اس کے باوجود قدرت نے ان پر جو فیوض و برکات عطا کیے تھے کوئی آدمی ان کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ اپنا بیگانہ ہر ایک ان کا چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی احترام کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے کئی بار ان کو بازار سے گزرتے ہوئے دیکھا اور ان کے احترام میں آس پاس کی کاروباری سرگرمیوں میں مشغول دکاندار اور گاہک ہر دو کو سراپا عجز ہوتے دیکھا۔ یہ تو ان کا حال تھا جو آپ کی شخصیت کے احترام پر مجبور تھے اور جو عجز و انکسار، وقار، متانت و حلم جیسی صفات ان کی شخصیت میں موجود تھیں وہ ان سب لوگوں سے کہیں بڑھ کر تھیں اور یہی وہ صفات تھیں جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی تھیں۔ مرکزی جامع مسجد باغ کے عقب میں ان کا مزار جہاں مرجع خلائق ہے وہیں یہ دینی مرکز لگ بھگ ایک صدی کے دینی و تاریخی تسلسل اور سید ثناء اللہ شاہ کی نصف صدی سے زائد عرصہ کی دینی خدمات کی پوری آب و تاب سے گواہی دے رہا ہے۔

☆☆☆

ترجمانِ اقبال

سابق صدر آزاد کشمیر غازی ملت سردار محمد ابراہیم خان کے تعزیتی ریفرنس میں شرکت کے لیے ہم راولاکوٹ پہنچے تو پتہ چلا کہ اس تقریب کی صدارت معروف ماہر اقبال اور ماہر تعلیم جناب پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کر رہے ہیں ۔ پروگرام کا آغاز ہوا تو باہر سے آئے ہوئے مختلف مہمان ادباء اور اہل علم نے غازی ملت کی شخصیت اور کارناموں کے حوالے سے اپنے اپنے انداز میں مقالے پیش کیے اور ان کی حیات وخدمات پر تفصیل سے بات کی ۔صدر تقریب کو جب سٹیج پر بلایا گیا تو پورا ہال ان کی شخصیت اور احترام میں کھڑا ہو گیا۔صدر تقریب نے جب اپنی گفتگو کا آغاز کیا تو سب منتظر تھے کہ وہ اپنے مقالے میں کن الفاظ سے غازی ملت کو خراج عقیدت پیش کریں گے مگر یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ نکلا۔

صاحب صدر نے بجائے مقالہ پڑھنے یا تحریری گفتگو کرنے کے ان الفاظ میں آغاز کیا کہ:

''مجھے اس پروگرام کے منتظمین نے اس تقریب میں شرکت کی دعوت اور غازی ملت کی شخصیت پر مقالہ تحریر کرنے کی درخواست کی تھی ،مگر میں جب ان پر کچھ لکھنے بیٹھا تو بہت غور وحوض کے بعد بھی آغاز نہ کر سکا وہ اس لیے کہ ایک طرف غازی ملت کی اتنی بلند اور جامع الصفات شخصیت اور دوسری طرف مجھ سا کم فہم ۔سو میرے لیے ان کی شخصیت کے شایان شان لکھنا تو کجا ان کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں شرکت ہی کسی بڑے اعزاز سے کم نہیں اُوپر سے منتظمین نے اتنی بڑی شخصیت کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں مجھے صدارت کی ذمہ داری بخش کر اہل راولاکوٹ کی محبتوں کا مزید مقروض کر دیا ہے جس کا میں نصف صدی قبل سے مقروض چلا آ رہا ہوں۔''

اس کے بعد انھوں نے اپنی زندگی کی پہلی ملازمت بطور سکول استاد بھرتی ہوکر 1953 میں راولاکوٹ آمد اور اہل راولاکوٹ کے حسن سلوک کا بطور خاص تذکرہ کیا......صدارتی گفتگو میں انھوں نے اور بھی باتیں کی مگر میں اس سارے وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک نے غازی ملت کی شخصیت اور کارناموں پر گفتگو کی مگر صدیقی صاحب نے کس طرح عجز سے اپنے آپ کو اس ساری بات سے الگ رکھا اور بظاہر اپنی کم مائیگی کا اظہار کر کے سب سے خوبصورت حرفِ خراج بھی پیش کر دیا۔ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی میرے لیے اس سے پہلے بھی اجنبی نہیں تھے بلکہ اتنی بار ان کی شخصیت اور کارہائے نمایاں میرے سامنے زیر بحث آ چکے تھے کہ ان سے ملنے کا اشتیاق لیے کب سے ملنے کا منتظر تھا اور آج قدرت نے وہ موقع فراہم کر دیا تھا جہاں ان سے بلمشافہ ملاقات ہونا تھی ۔ یہ میری پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کے ساتھ پہلی ملاقات تھی جو دوستوں کے توسط سے راولاکوٹ میں ہوئی۔

ہم نے دبستان لکھنو اور لکھنوی تہذیب کے بارے میں کتابوں میں ہی پڑھا ہے، بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے لکھنو کی اس تہذیب کو یہاں رہتے ہوئے دیکھا ہو۔اس لیے کہ تقسیم برصغیر کے وقت ہمارے پاس براہ راست لکھنو سے لوگ ہجرت کر کے نہیں آئے اور جو آئے بھی وہ کراچی، لاہور یا دیگر بڑے مراکز کے ہو گئے ۔ دوسرے اگر کسی نے اس تہذیب سے براہ راست کسب فیض کیا بھی تھا تو وہ بھی ہم تک خال خال ہی پہنچا ہوگا۔مگر ایک ایسا شخص جو صحیح معنوں میں اس لکھنوی تہذیب کا نمائندہ بھی تھا اور قدرت نے اسے تیار کر کے اس خطہ ارضی پر بھیجا وہ بلاشبہ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی تھے۔

اہل کشمیر کی خوش قسمتی دیکھیے کہ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی اتر پردیش (یو پی موجودہ بھارت) کے ضلع سلطان پور میں 1925 میں پیدا ہوئے ۔سلطان پور اور فیض پور سے ابتدائی تعلیمی مدارج طے کرنے کے بعد الہٰ آباد یونیورسٹی سے تاریخ اور فارسی کے اختیاری مضامین کے ساتھ بی اے کیا اور بعد ازاں 1947 میں الہٰ آباد یونیورسٹی سے ہی ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا۔1949ء میں پاکستان کی محبت ان کو آبائی علاقے سے اُٹھا کر کراچی لے آئی جہاں ان کے بھائی محمد امین صدیقی پہلے سے ہی موجود تھے۔کراچی کی آب و ہوا راس نہ آئی تو اپنے کزن ڈاکٹر افتخار صدیقی کے پاس لاہور آ گئے ۔یہیں پنجاب یونیورسٹی سے 1953ء میں ایم اے

اُردو کیا اور اسی سال پہلے سینئر استاد کے طور پر راولاکوٹ اور بعد ازاں لیکچرار اُردو کے طور پر میر پور تعینات ہوئے۔ یوں لکھنوی تہذیب کا یہ استعارہ پہلے کراچی پھر لاہور اور پھر وہاں سے آزاد کشمیر کا ہو کر اپنے حقیقی مقام پر پہنچ گیا۔ میں اس حوالے سے خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے پروفیسر عبدالعلیم صدیقی جیسی لکھنوی تہذیب کی اس نمائندہ شخصیت کے ساتھ کئی بار ملنے، بیٹھنے اور اکتساب حاصل کرنے کا موقع میسر آیا۔

جہاں تک پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کی شخصیت کا تعلق ہے یہاں کون ایسا ہے جو ان کی شخصیت، ان کی بطور ایک استاد، بطور ماہر تعلیم، بطور ماہر اقبال اور علمی ادبی خدمات اور کار ہائے نمایاں کا انکار کر سکے۔ ایک ایسا شخص جس کی شخصیت، جس کی عزت اور احترام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت کم بازار جاتے مگر جب کبھی وہ پلندری بازار میں نکلا کرتے تو آس پاس کی دونوں طرف کی دکانوں سے دکاندار اور عام راہگیر ان کی عزت اور احترام میں کھڑے ہونا شروع ہو جاتے۔ اگر راستے میں کوئی ملتا یا سوال کرتا تو وہیں رک جاتے اور جب تک اس سے بات مکمل نہ ہو جاتی آگے نہ بڑھتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک استاد کی صحیح معنوں میں شخصیت کا جو عکس بنتا ہے اس کو اگر تصویر کے قالب میں ڈھالا جائے تو پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کی تصویر بنتی ہے۔ ایک استاد کو ایسا ہی ہونا چاہیے کہ اس کے سامنے کھڑا ہونے والا اس کا طالب علم عقیدت اور احترام میں اپنے استاد کے قدموں میں بچھنے لگے۔

جب ہم کشمیر میں اُردو زبان و ادب کی ترویج کی بات کرتے ہیں تو براہ راست موجودہ منظر نامے کو دیکھتے ہیں اور اس میں بالخصوص باغ کے حوالے سے پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کی خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم کشمیر میں اُردو زبان کی ترویج اور ترقی کے حوالے سے ارتقاء پر نگاہ ڈالتے ہیں تو تحریری حوالہ جات میں اُردو کی ایک قدیم مثنوی جو میر پور کے ایک شخص میاں غلام محی الدین میر پوری نے ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۷ء) میں چالیس صفحات پر مشتمل ''گلزار فقیر'' کے نام سے تحریر کی تھی اور جس پر مصنف اور کاتب کا نام اور سال تصنیف بھی درج ہے کو اُردو زبان کی پہلی باقاعدہ تحریر کہا جاتا ہے۔

کشمیر میں اُردو زبان کی ترویج اور ترقی کے حوالے سے شاعری میں بلاشبہ تحریری حوالہ جات کے اعتبار سے محمود گامی (۱۷۶۵ء) کی ایک غزل کو جس کا زیادہ تر حصہ اگرچہ فارسی میں ہے تاہم اس میں کثرت

سے اُردو زبان کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں کو وثوق سے کشمیر میں سب سے پہلی اُردو غزل کہا جاتا ہے جسے ایک کشمیری شاعر نے کہا ہے۔ اُردو زبان کی ترویج میں ریاست میں قائم ہونے والے پہلے مطبع (پرنٹنگ پریس) احمدی پریس کا بھی ایک کردار ہے جو ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا، ۱۸۶۸ء میں وکرم بلاس پریس کے نام سے ایک اور سرکاری پریس قائم ہوا جہاں مختلف زبانوں میں کتابوں اور دفاتر سے متعلق فارم اور سٹیشنری چھاپی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ۱۹۲۵ء میں پرتاب سنگھ کے عہد کے خاتمہ پر کشمیر میں سرکاری چھاپہ خانوں کے ساتھ ساتھ کئی ایسے پریس قائم ہو چکے تھے جہاں کتب، رسائل اور اخبارات چھاپے جاتے تھے۔

آزاد کشمیر کے قیام کے بعد جب دارالحکومت کو مظفرآباد منتقل کیا گیا تو وہاں دیگر سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادب کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے بھی کوشش کی گئی چنانچہ 1949ء میں محمد یوسف علیگ کی صدارت میں پہلی ادبی تنظیم بزم ادب کا قیام عمل میں لایا گیا جو 1954ء تک کام کرتی رہی۔ بعدازاں حلقہ ارباب ذوق 1953ء، انجمن ترقی اردو 1966ء بزم اقبال، بزم فکر و دانش، مجلس ادب، کشمیر اکیڈمی اور دیگر ادبی تنظیمیں مختلف اوقات میں قائم کی جاتی رہیں جنہوں نے مظفرآباد کی سطح پر ادب کے اس ننھے پودے کی آبیاری کر کے اس کو تناور شجر بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔

آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر کے قیام کے وقت اگرچہ باغ میں ادبی حوالے سے بہت زیادہ کام نہیں ہوا تھا اس کے باوجود باغ کو اس حوالے سے آزاد کشمیر کے دیگر شہروں پر فوقیت حاصل ہے کہ یہاں سردار گل احمد کوثر، سید احمد شاہ (ہل سرنگ)، سردار محمد اکرم خان (چمیاٹی)، خواجہ غلام حسین نسیم باغ (جوش ثانی)، فدا حسین فدائی، گل حسین تھب (پیسہ اخبار کے نائب مدیر) جیسی شخصیات موجود تھیں جو کسی نہ کسی طور پر اپنی سیاسی، سماجی، مذہبی اور ملّی مقاصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی طور پر اُردو زبان کے فروغ میں بھی کوشاں تھے۔ ان تمام شخصیات میں سے ایک ایسا شخص جو اگرچہ یہاں کا مقامی نہیں تھا اور محض اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی تکمیل کے سلسلہ میں تعینات ہو کر باغ آیا اور اپنے مختصر عرصہ تعیناتی کے دوران باغ میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑ کر گیا جو آج بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ باغ کے ادبی اُفق پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نقوش چھوڑنے والی شخصیت بلاشبہ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کی تھی۔

اہل باغ اس حوالے سے پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کے مقروض ہیں کہ آج باغ میں شعر وادب کی جو فضا موجود ہے اور جتنے بھی لوگ کسی نہ کسی سطح پر ادب کے ساتھ منسلک ہیں اور تصنیف وتالیف کی دنیا کے شناور ہیں وہ سارے ہی پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کی علمی وادبی خدمات کے بلواسطہ یا بلا واسطہ مقروض ہیں۔ ایک ایسا شخص جو آج سے اٹھاون سال پہلے باغ جیسی جگہ پر آ کر 1967 میں جہاں گورنمنٹ انٹر کالج باغ کا بانی پرنسپل تعینات ہوتا ہے وہیں اپنی پہلی کلاس کی آبیاری ہی اس خوبصورتی سے کرتا ہے کہ اس کی پہلی کلاس سے فارغ ہونے والے طلبہ میں سے کوئی تو اسلم راجا بنتا ہے جو ''کونپل کا بدن'' جیسی کتاب تخلیق کر کے باغ کے ادبی اُفق پر پہلی شعری بیاض کا خالق بنتا ہے، کوئی الطاف عاطف کی شکل میں فوجی ہوتے ہوئے بھی ''جھیل کا چاند'' جیسی خوبصورت کتاب تخلیق کرتا ہے تو کوئی پروفیسر شفیق راجا بنتا ہے جو آج طلوع ادب جموں وکشمیر کے صدر نشیں ہیں اور سات ادبی تصانیف کو دامن میں سموئے اور درجن بھر زیر طبع کتابوں کی نوک پلک سنوارتے بیسیوں شعر وادب کی دنیا کے نوادروں کو ادب کی دنیا سے متعارف کرا رہے ہیں۔

اُردو زبان کی ترویج اور عہد حاضر میں آزاد کشمیر کے تمام بڑے شہروں میں ادبی حلقے موجود ہیں جو بساط بھر اپنی کوششوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، وہیں کچھ لوگ انفرادی سطح پر اپنی اپنی کوششوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ باغ اس حوالے سے آزاد کشمیر کے دیگر شہروں میں ممتاز مقام رکھتا ہے کہ جہاں ماضی میں شعر و ادب کی شناخت اور پرداخت کے حوالے سے یہاں کام ہو رہا تھا وہیں 1998 سے طلوع ادب کی صورت میں ادبی فورم کی تشکیل کے بعد منظم طور پر جس طرح یہاں کام ہو رہا ہے، سہ ماہی مطلع کا باقاعدگی سے اجراء ہو رہا ہے اور اس فورم سے وابستہ درجنوں شعراء وادباء کی تصانیف منظر عام پر آ رہی ہیں ان تمام کا سہرا اور نقطہ آغاز اگر پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کو قرار نہ دیا جائے تو یہ زیادتی ہوگی۔

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی نے ایک ایسے وقت میں باغ میں قدم رکھا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ شعور و آگہی اور ادب کی ترویج کے لیے اپنا کردار ادا کرنا شروع کیا جب کم از کم باغ میں اس طرح کی کوئی باقاعدہ روایت موجود نہیں تھی۔ ایک ایک طالب علم کی نوک پلک سنوارنا، اس کی اصلاح کرنا، اس کو زبان وادب کے اسرار ورموز سے آگاہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر جس کام کا وہ عزم مصمم کر کے آئے تھے اپنے تین سالہ قیام

کے دوران اس کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر کے یہاں سے ٹرانسفر ہوئے۔ یہ ان کے خلوص، محنت اور لگن کا اعجاز تھا کہ باغ میں شعر و ادب کی کونپلیں پھوٹنا شروع ہوئیں اور اس پر بھی کام شروع ہوا جو 1984ء میں اسلم راجا کی ''کونپل کا بدن'' کی صورت میں باغ سے پہلی شعری کاوش بنی۔

پروفیسر شفیق راجا کے بقول مجھے اپنی زندگی میں جتنے اساتذہ بھی میسر آئے میرے ذہن پر سب سے زیادہ مضبوط نقش پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کی شخصیت کے رہے ہیں۔ ان کا پڑھانے کا انداز اتنا دلنشین ہوتا تھا کہ اگر وہ گھنٹوں بھی بات کر رہے ہوں تو کیا مجال کہ کوئی ادھر اُدھر توجہ کر سکے۔ ان کے بقول ایک مرتبہ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کلاس میں ایک شعر کی تشریح کروا رہے تھے جس میں مے کشی کا ذکر تھا۔ اس شعر کی تشریح کا انداز اتنا دلچسپ تھا کہ ہمیں آس پاس کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ ایسے میں ہمارے ایک کلاس فیلو نے ان سے سوال کر دیا کہ آپ جس گہرائی میں جا کر تشریح کروا رہے ہیں اور اس کی جزیات بیان کر رہے ہیں کیا آپ نے کبھی خود شراب نوشی کی ہے۔ یہ سننا تھا کہ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کا چہرہ سرخ ہو گیا، انھوں نے کچھ دیر توقف کیا اور اس کے بعد صرف اتنا کہا ''میرے عزیز مزاح اور مذاق میں باریک سا فرق ہوتا ہے میں چاہتا ہوں کہ یہ فرق ہمیشہ ملحوظ رہے۔ ان کے کہنے کا انداز اتنا بارعب اور پُر اثر تھا کہ ساری کلاس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کے بعد کبھی ان کی کلاس میں کبھی کسی کو جرات نہیں ہوئی کہ وہ ان سے مذاق کر سکے یا کوئی اور بات کر سکے۔

بقول پروفیسر شفیق راجہ:

''پروفیسر عبدالعلیم صدیقی اس حوالے سے قابل تعریف ہیں کہ میر پور تعیناتی کے دوران ان کے ہم عصر پروفیسر شیخ محمود احمد تھے جو بعد ازاں ڈائریکٹر کے عہدے پر بھی تعینات رہے۔ یاد رہے کہ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کو پہلی ملازمت پر تعینات کرنے والے یہی پروفیسر محمود احمد تھے۔ پروفیسر محمود احمد نے علامہ اقبال کی تصنیف اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ پروفیسر موصوف کی شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کی اسرار خودی جب شائع ہوئی تو پروفیسر اے آر نیکلسن نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا

جو مغرب میں بہت مقبول ہوا مگر جب پروفیسر محمود احمد نے اسرارِ خودی کا ترجمہ کیا تو ماہرین اور نقادانِ اقبال کے نزدیک پروفیسر محمود احمد کا کیا گیا ترجمہ پروفیسر اے آر نیکلسن کے ترجمہ سے زیادہ وقیع تھا اس لیے کہ پروفیسر موصوف انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے جب کہ پروفیسر اے آر نیکلسن فارسی کے معاملے میں پروفیسر محمود احمد جتنی دسترس نہیں رکھتے تھے۔ایسی شخصیت کی موجودگی میں علامہ اقبال جیسی بڑی شخصیت کی ایک نہیں آٹھ فارسی تصانیف کو اُردو کے قالب میں منظوم ڈھالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔مگر آفرین ہے پروفیسر عبدالعلیم صدیقی نے اس مشکل ترین کام کو اپنے ذمہ لیا تو پایا تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔''

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی نے اپنی زندگی کے لگ بھگ ساٹھ سال اس دشت پیمائی میں بسر کیے اور اس سارے عرصہ کی ریاضت ان کی علامہ اقبال کی آٹھ فارسی تصانیف ''اسرارِ خودی'' کی ''جہانِ خودی''، ''رموزِ بےخودی'' کی ''عرفانِ خودی''، ''زبورِ عجم'' کی ''نغمہ سروش''، ''پیامِ مشرق'' کی ''نوائے شرق''، ''جاوید نامہ'' کی ''سیرِ افلاک''، ''ارمغانِ حجاز'' کی ''ارمغانِ مشرق''، ''بندگی نامہ'' کی ''بندگی نامہ'' اور ''پس چہ باید کرد'' کی ''کیا رنگ ہو تدبیر کا'' کی صورت میں منظر عام پر آئیں۔علامہ اقبال اور فکر اقبال کے ساتھ ان کی وابستگی کا عالم تو دیکھیں کہ اس سارے عرصہ میں انھوں نے اپنی ذاتی تصنیفات کی طرف توجہ نہیں کی۔اس ساری ریاضت کا ثمر ان کو بطور ''ماہر اقبال'' اور حکومت پاکستان کی طرف سے ''تمغہ امتیاز'' کی صورت میں عطا ہوا اور پروفیسر عبدالعلیم صدیقی فکر اقبال کے نقیب قرار پائے۔ان کی ذاتی شاعری پر مشتمل کتاب ''نہاں خانۂ دل'' ان کی وفات کے بعد شائع کرائی گئی۔

ان کی وفات کی اطلاع ہم سب کے لیے غم والم کے ساتھ اُردو ادب اور فکر اقبال کے ایک پورے عہد کے اختتام کی صورت میں ان سے وابستہ، ان سے محبت کرنے والے، ان کے عقیدت مندوں، ان کے ہزاروں شاگردوں اور ان کے تمام سوگواران کے لیے کسی بڑے سانحہ سے کم نہیں تھی۔نماز جنازہ میں ہزاروں کا مجمع آزاد کشمیر کے ہر ایک شہر سے پلندری میں ان کے گھر کے قریب نماز جنازہ کی ادائیگی اور ان کو خراج

عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع تھا۔ان میں وہ سب بھی تھے جنھوں نے پروفیسرعبدالعلیم صدیقی سے کسب فیض حاصل کیا تھااور وہ سب بھی جو محض ایک استاد کی محبت میں موت العالم موت العاَلم کی عملی تفسیر کی صورت میں ان کو آخری خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع تھے۔

ایک ایسا شخص جو 1925ء میں بھارت کے صوبے اتر پردیش کے ضلع سلطان پور سے اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔اپنی زندگی کی 84 بہاریں علم وادب کی ترویج میں صرف کرتا ہوا اپنے آبائی علاقے سے ہزاروں میل دور پلندری کے مقام پر 2009ء میں مٹی کی آغوش میں کفن اوڑھ کر سو جاتا ہے۔پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کی ساری ریاضت کی کل کمائی ان کا وہ علمی اورادبی اثاثہ ہے جو وہ اپنے پیچھے اپنے سوگواران کے لیے چھوڑ کر گئے۔ایک انٹرویو میں ڈاکٹر راشد حمید چیئر مین ادارہ فروغ قومی زبان اسلام آباد نے اپنی ایران میں ہونے والی ایک گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مجھ سے جب ایران میں یہ پوچھا گیا کہ پاکستان میں علامہ اقبال کے مستقبل کے حوالے سے آپ کیا دیکھتے ہیں تو میرا ان کو یہ جواب تھا کہ پاکستان میں علامہ اقبال کے مستقبل کے حوالے سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا ہاں جب تک فارسی زبان زندہ ہے علامہ اقبال زندہ ہے۔بالکل ایسے ہی جب تک علامہ اقبال کی فارسی شاعری زندہ ہے تفہیم اقبال کے حوالے سے پروفیسرعبدالعلیم صدیقی کا ان کے تمام فارسی کلام کی تفہیم کا کام زندہ ہے۔یہ وہ تمغہ امتیاز ہے جو بعداز مرگ بھی ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

☆☆☆

باغِ ادب کا باغباں

حال ہی میں پوری دنیا سے بیسٹ ٹیچر آف دی ائیر کا انتخاب کرنے کے مقابلہ منعقد کیا گیا، تمام ممالک کے اساتذہ نے اس میں حصہ لیا۔ مقابلے کے قواعد کے مطابق جب دنیا کے ۱۰ بہترین اساتذہ کو دبئ میں بلا کر انعامات سے نوازا گیا تو پہلا نمبر ملائیشیاء سے تعلق رکھنے والی ۵۲ سالہ ایک خاتون ٹیچر کے حصے میں آیا جو گزشتہ ۳۰ سال سے ملائیشیاء میں ایک مڈل سکول چلا رہی ہے۔ اس مقابلے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں حصہ لینے والے ٹیچر نے یہ ثابت کرنا تھا کہ اس نے انفرادی سطح پر تدریس میں کیا خاص کارنامہ سرانجام دیا۔ جب سٹیج سے اول نمبر پر آنے والی خاتون ٹیچر کا نام پکارا گیا تو ساتھ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ اس ٹیچر کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ اپنی مدد آپ کے تحت پرائیویٹ سطح پر یہ ادارہ چلا رہی ہیں۔ اس ادارہ میں صرف کلاس نرسری میں ۳۵ بچوں کو داخلہ دیا جاتا ہے یہی طلبہ مڈل کا امتحان پاس کر کے اس سکول سے فارغ ہوتے ہیں مگر جب وہ آٹھویں کا امتحان پاس کرتے ہیں تو ان میں سے ہر طالب علم کی یہ انفرادیت ہوتی ہے کہ وہ ایک بہترین طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین لکھاری (رائٹر)، بہترین آرٹسٹ، بہترین مقرر اور بہترین انسان بھی ہوتا ہے۔ یوں ہر سال یہ سکول معاشرے کو ۳۵ بہترین طالب علم، بہترین لکھاری اور بہترین انسان بھی مہیا کرتا ہے جس پر یہ خاتون ٹیچر بیسٹ ٹیچر آف دی ائیر ایوارڈ کی مستحق ہیں۔

۱۹۶۷ء میں باغ میں گورنمنٹ انٹر کالج باغ کا قیام عمل میں لایا گیا، اس کے پرنسپل کے لیے معروف ماہر تعلیم، صدارتی ایوارڈ یافتہ، تمغہ امتیاز، ماہر اقبال پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کی خدمات حاصل کی گئی۔ کالج کی پہلی کلاس جن طلبہ پر مشتمل تھی ان میں اسلم راجا، الطاف عاطف اور شفیق راجا کا نام نمایاں ہیں ان میں سے بعد میں اسلم راجا بطور شاعر اور ادیب معروف ہوئے اور 'کونپل کا بدن'، 'تاریخ نارمہ' اور 'گل نغمہ' جیسی

کتابوں سے شہرت حاصل کی۔ الطاف عاطف آنریری کپتان کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور 'جھیل کا چاند' کے شاعر کے طور پر معروف ہوئے جبکہ شفیق راجا کی وجہ شہرت کوئی ایک نہیں کثیر جہتی بنی۔ یوں یہاں ایک نہیں دو شخصیات یعنی پروفیسر عبدالعلیم صدیقی اور پروفیسر شفیق راجا نہ صرف اپنی تدریسی خدمات بلکہ اپنی ادبی اور فنون لطیفہ میں ذات سے زیادہ با قاعدہ جماعت کی شکل میں بہت سے دیگر قلم کاروں کی دریافت اور تربیت سے آراستہ کر کے اپنے عہد کے بہترین استاد کے طور پر معروف ہوئے۔

کہتے ہیں کہ انگریز کے دور حکومت میں برصغیر میں جب شمس العلماء کا خطاب دینے کے لیے نمائندگیاں مرتب کی جارہی تھیں تو علامہ محمد اقبال نے اپنے استاد مولوی میر حسن کا نام پیش کیا۔ اس پر انگریز افسر نے اعتراض کیا کہ یہ خطاب صرف اس شخص کو دیا جاتا ہے جس کی کوئی تصنیف ہو، تو علامہ اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ ان کی زندہ جاوید تصنیف میں خود ہوں۔ سو علامہ صاحب کے اس مدلل جواب پر مولوی میر حسن کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔ بعینہ شفیق راجا کی تصنیفات صرف کتابی صورت میں نہیں زندہ جاوید درجنوں میں ہیں۔

ایک ایسا شخص جس نے اپنی ۴۳ سالہ زندگی میں سے ۳۶ سال بطور سپورٹس مین کھیل کے میدان میں گزارے ہوں کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، بیڈمنٹن صرف کھیلا ہی نہیں بلکہ باغ میں سب سے پہلے سپورٹس کلب کی بنیاد ڈالی۔ نوجوان لڑکوں کو جمع کیا اُنھیں منفی سرگرمیوں سے بچا کر کھیل جیسی مثبت سرگرمی کے ساتھ جوڑا۔ خود اپنی جیب سے ہزاروں روپے خرچ کر کے مختلف اضلاع میں ٹیم لے کر جانا اور مقابلوں میں حصہ لینا ان کے لیے سپورٹس کٹِ تیار کرانا اور کھیل کے ساتھ کمٹمنٹ کا یہ عالم کہ جس دن ان کی شادی ہو رہی ہے اسی دن راولاکوٹ میں ہاکی کا ڈسٹرکٹ فائنل میچ کھیلا جارہا ہے لہٰذا دلہن کو گھر پہنچا کر فائنل کھیلنے راولاکوٹ چلے جاتے ہیں۔

ان کے بقول: ۱۹۸۷ء کے کرکٹ ورلڈ کپ کے دوران گلے میں اچانک تکلیف ہوگئی۔ باوجود علاج کے افاقہ نہ ہوا اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق سی ایم ایچ راولپنڈی میں ایڈمٹ ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے گلے کا آپریشن تجویز کیا تو بجائے اس کے کہ اپنی صحت کی فکر ہوتی زبان پر ایک ہی دعا تھی کہ

اے اللہ ورلڈ کپ کے فائنل سے پہلے مجھے موت نہ دینا، یہ الگ بات کہ آپریشن کامیاب ہو گیا اور وہ جلد روبصحت ہو کر واپس لوٹے۔

ان کی زندگی کے ابتدائی ایام جہاں ایک طرف سکول کی رسمی تعلیم میں گزرے وہیں ایک بڑا حصہ مدرسہ تعلیم القرآن باغ میں بڑے قاری صاحب (قاری شجاع الملک) کی نگرانی میں گزرا قرآن کریم کی تجوید اور حفظ میں گزرا جس کا اثر ان کی زندگی پر نمایاں ہے۔ یہ الگ بات کہ گردش زمانہ نے ان کے حفظ کے خواب کو شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا۔ بطور ڈرائنگ ٹیچر اپنے پیشہ وارانہ کیریئر کا آغاز کرنے والے شفیق راجا جتنا عرصہ سکول میں رہے ریاضی پڑھاتے رہے مگر آرٹ، ڈرائنگ، خطاطی اور مصوری میں کسی بڑے آرٹسٹ سے کم نہیں تھے۔ تعلیم و تدریس کے ساتھ ان کی وابستگی چالیس سال سے زائد پر مشتمل ہے جس کا ابتدائی حصہ بطور ڈرائنگ ٹیچر اور باقی شعبہ کالجز میں تدریس اور بطور منتظم گزرا۔

اپنے سکول کے زمانہ تدریس میں سب سے کم عمر ہونے کی وجہ سے ''نکے استاذ'' کے طور پر بطور ڈرائنگ اور ریاضی ٹیچر خوب شہرت کمائی۔ یہ الگ بات کہ جب اعلیٰ سطح پر تدریس شروع کی تو بعد کے عرصہ میں اپنے طبعی میلان یا ذاتی تساہل کی وجہ سے طلبہ ان کی تدریس سے شاقی رہے۔ اس کے برعکس جو جو احباب ان سے ادبی، روحانی، فنون لطیفہ یا زندگی کے جس پہلو سے بھی اکتساب کرتے رہے وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ اگر ایک ادھ یا چند نشستوں میں ہی انھوں نے ان سے اکتساب حاصل کیا ہے تو وہی ان کی زندگی کا کل حاصل ہے۔

۱۹۸۲ء میں پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے لیکچرار اُردو بنے تو پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا، اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر، پروفیسر اور پرنسپل کے عہدے تک کا ہر ایک مرحلہ کچھ ایسے طے کیا کہ خود ان کو بھی اس کی خبر نہیں۔ شفیق راجا کا معمول تھا کہ اپنی ذاتی گاڑی پر کالج جاتے۔ راستے میں عموماً میرے سسر کریم اللہ خان کے پٹرول پمپ سے گاڑی میں پٹرول ڈلواتے تو وہ ان کو پرنسپل صاحب کہہ کر مخاطب کرتے۔ تعلیمی پیکج آیا نئے کالج بنے کچھ اپ گریڈ ہوئے اور شفیق راجا پرنسپل بن گئے، آرڈر ملا تو حاضری دینے کے لیے جب گھر سے نکلے تو سیدھے ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ میں بہت جونیئر تھا کیا پتا کب پرنسپل بنتا اور

مجھے پرنسپل بننے کا شوق بھی نہیں تھا مگر آپ کے بار بار پرنسپل کہنے سے میں آج واقعی پرنسپل بن گیا ہوں۔

بعض لوگوں کی شخصیت کا خاصا یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں بہت سے کام کر رہے ہوتے ہیں اس کے برعکس شفیق راجا ایک وقت میں ایک ہی کام کرنے کے عادی ہیں۔ جب میدان میں تھے تو ساری وابستگی اور یکسوئی صرف اور صرف کھیل اور اس کے متعلقہ معاملات کے ساتھ اور جب وہاں سے نکلے تو ساری وابستگی مسجد کے ساتھ، میڈیکل سٹور پر دوائیوں سے آشنائی کا یہ عالم کہ سب ایلو پیتھک ادویات کے خواص ازبر کر رکھے ہیں اور ایک فزیشن سے بڑھ کر ادویات کا مزاج سمجھنا اور تیر بہدف نسخہ تجویز کرنا، کلاس میں ہیں تو ہمہ تن کلاس کے ہو کر اور جب وہاں سے نکل کر شام کے اوقات میں اپنے ہاسٹل کے ساتھیوں کے ساتھ ہیں تو خوش گپیوں اور تاش یا کسی سیاحت پر پوری یکسوئی سے۔ تبلیغ کے ساتھ نکل گئے تو گھر کی خبر نہیں اور جب واپس گھر آ گئے تو باہر کی طرف دھیان نہیں۔ شعر و ادب کی محفل میں ہیں تو سر تا پا ادب کے رنگ میں رنگے ہوئے اور وہاں سے نکل کر علماء و مشائخ کے ساتھ ہیں تو وہاں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر کام میں جہاں نفاست ہے وہاں مکمل محویت اور کاملیت۔ سیرت و تاریخ پر بات کر رہے ہیں تو جزئیات کے ساتھ ایک ایک واقعہ اور بات کا اس طرح اظہار کہ گویا سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہے اور محفل یاراں میں ہیں تو یاروں کے یار باش..................

ہم میں سے ہر آدمی ایک وقت میں کسی ایک ہی کام کا ماہر ہوتا ہے اور اس کی ساری توجہ بھی اسی کام اور پیشے کی حد تک ہوتی ہے باقی کاموں میں اس کا علم اور مہارت محض جزوی سی ہوتی ہے۔ اس معاملے میں بھی پروفیسر شفیق راجا کمال مہارت کے حامل اور مہارت بھی وہ جس کے ذریعے مکمل اعتماد سے اس طرح وہ کام سر انجام دینا کہ گویا وہ صرف اسی کام اور مہارت کے لیے بنے ہیں۔ ان کی یہی وہ خصوصیات ہیں جو انہیں اپنے پیشروؤں، اپنے ہم عصروں اور اپنے بعد والوں میں ان کو جدا کرتی ہیں۔

میں نے کئی مرتبہ اس بات پر غور کیا کہ ان کا ذاتی شعبہ اور میدان کیا تھا جس میں ان کی مہارت ہے اور وہ کون سا مضمون ہے جس میں ان کا علم محض ضرورت پوری کرنے کی حد تک ہے مگر جس جس موضوع اور شعبے پر جس نے بھی بات کی ان کو مکمل پایا۔ قرآن و حدیث فہمی سے لے کر تاریخ، تصنیف، ادب، شاعری،

اسلامیات،مصوری،جغرافیہ دانی ہر ایک مضمون ان کا ذاتی مضمون لگا۔انٹرنیٹ کے اس تیز ترین دور اور سوشل میڈیا کی اس بھر مار میں سب سے زیادہ نقصان مطالعہ اور کتاب سے دوری کی صورت میں سامنے آیا ہے ان حالات میں بھی پروفیسر شفیق راجا کو میں نے باقاعدگی سے کتابیں خریدتے ، ان کا مطالعہ کرتے اور پھر ان موضوعات پر باقاعدگی سے احباب کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھا ہے۔جو یقیناً اگر ناممکن نہیں تو کارِ مشکل ضرور ہے اور یہ ان کی وہ انفرادیت ہے جو ان کو اپنے ہم عصر ادباء میں جدا کرتی ہے۔

ہم نئے نئے کالج میں آئے تو سخن فہمی اور سخن وری کا شوق سمایا جو کچھ لکھتے آپس میں ایک دوسرے دوستوں کو سناتے۔کسی نے رائے دی کہ پوسٹ گریجویٹ کالج باغ میں شعبہ اُردو کے پروفیسر شفیق راجا بہت اچھے شاعر ہیں اپنا کلام اُن کو دکھائیں۔ایک دن میں اور میرا ایک دوست سیدھے ان کے گھر جا پہنچے۔پروفیسر شفیق راجا سے ہونے والی یہ پہلی ملاقات جہاں میرے ادبی سفر کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی وہیں پروفیسر شفیق راجا کے ادبی سفر کا ایک نیا باب کہی جا سکتی ہے۔طلوع ادب باغ کا قیام بلاشبہ انہی ملاقاتوں کا تسلسل ہے۔جس نے نہ صرف اس خطہ باغ بلکہ آزاد کشمیر کے دیگر اضلاع اور مضافات میں پوشیدہ ان گہر ہائے آبدار کو دریافت کیا جو آج ادبی دنیا میں اپنا ایک نام اور مقام رکھتے ہیں۔

کہتے ہیں بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جس کی محفل میں کوئی خود کو چھوٹا نہ سمجھے یہ قول پروفیسر شفیق راجا کی ذات پر سو فیصد صادق آتا ہے ۲۰۰۱ء سے لے کر اب تک طلوع ادب کے صدر نشیں کی حیثیت سے جس طرح شفیق راجا نے ہر ایک کو بلا تفریق رنگ،نسل،مسلک اور حیثیت کے ایک ساتھ چلایا ہے جس طرح ان کی نگہداشت اور تربیت کی ہے یہ اعزاز کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔۔میں حرف حرف سمیٹوں،نعت کا سفر،اُجلی دھرتی سُچے لوگ،عشق دم جبرئیل،کدل،دخل در معقولات اور لفظ کا کاجل جیسی تخلیقات کے خالق ہونے کے باوجود انکساری کا عالم یہ ہے کہ فرماتے ہیں ہماری مثال اُن اَن گھڑے پتھروں کی سی ہے جس پر کل ادب کے افق پر ادبی عمارت تعمیر ہونا ہے اور ہم نے بنیاد کا کردار ادا کرنا ہے۔اپنی کتاب کدل (بمعنی پُل) کے نام رکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ لوگوں کے درمیان میرا کردار پُل کا ہے۔پچھلی جنریشن اور اس جنریشن کے درمیان رابطے کا ہے۔

گزشتہ پچیس سال سے طلوع ادب کے صدر نشیں کی حیثیت سے جس احسن انداز سے انھوں نے ذمہ داری نبھائی ہے اس کی کسی بڑے سے بڑے ادبی مرکز اور ادبی تنظیم سے مثال نہیں دی جاسکتی۔طلوع ادب کے ساتھ وابستہ تمام ہی تخلیق کار اور ادب سے وابستہ احباب باوجود مختلف نوعیت کے قبیلائی،لسانی،مسلکی اور فرقہ وارانہ پس منظر کے طلوع ادب کے پلیٹ فارم پر جس طرح شیر و شکر ہیں اس کا سارا کریڈٹ پروفیسر شفیق راجا کے سر جاتا ہے۔تنظیم سے وابستہ ہر ایک فرد کی رائے کا احترام کرنا،ہر ایک فرد کی انفرادی طور پر تربیت کرنا ،ان کی خام تخلیقات کو اس طرح سراہنا کہ وہ مزید حوصلے اور محنت کے ساتھ اگلی بار اپنی تخلیق کو اور بہتر کر کے پیش کرتا ہے یقیناً یہ سب ان کی محبت،شفقت اور تربیت کے بل بوتے پر ہے۔

ادبی تنظیموں کے حالات و واقعات کو دیکھا جائے تو وہاں عموماً اختلاف رائے دیکھنے کو ملتا ہے اور کم عرصہ میں ہی احباب ذیلی اکائیوں میں تقسیم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔اس کے برعکس طلوع ادب میں ہر فرد دوسرے کا احترام کرتا اور اس کو آگے کرتے ہوئے ذات کی نفی کرتا نظر آتا ہے۔یہ کوئی عام سی یا ذرا سی بات نہیں بلکہ لگ بھگ چوبیس سال سے زائد کے تسلسل کا ناقابل تردید ثبوت ہے جس کی اپنے پرائے سب ہی گواہی دیتے ہیں۔ان کی اسی محنت اور جانفشانی کا ثمرہ ہے کہ طلوع ادب آزاد کشمیر بھر میں دیگر ادبی تنظیموں کے برعکس زیادہ فعال،منظّم اور تسلسل کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔صرف باغ ہی نہیں بلکہ آزاد کشمیر کے دیگر شہروں میں اس تنظیم کے ذیلی دفاتر ان شہروں اور مضافات سے وابستہ ادباء کی تربیت کرتے نظر آتے ہیں۔

عموماً مشاہدے میں آیا ہے کہ جب کوئی آدمی عمر کی بالائی حد عبور کر کے بڑھاپے میں داخل ہو جاتا ہے تو نئی نسل کا ساتھ نہیں دے سکتا یہی فرق جنریشن گیپ کہلاتا ہے۔یہ آج گھر گھر کی کہانی ہے جہاں گھر کے بڑے اپنے ہی گھروں میں اجنبی ہو کر رہ گئے ہیں۔گھر میں مرکز نگاہ ہونے کی بجائے کونے کے کسی کمرے میں پڑے ہیں۔اس کی دیگر وجوہات میں سے ایک اہم وجہ اُن بڑوں کا اپنی ہی دنیا میں رہنا اور نئی نسل کو کچھ نہ سمجھنا اور جواباً نئی نسل کا اپنے بزرگوں کو سٹھیایا ہوا قرار دے کر اپنی عملی زندگی میں رکاوٹ سمجھنا اور کنارا کر دینا ہے۔

شفیق راجا کا کمال یہ ہے وہ جب اپنی عمر سے کم عمر کے لوگوں میں بیٹھتے ہیں تو دوسروں کو اپنی سطح پر لانے کی بجائے خود کو اُن کی سطح پر لے آتے ہیں۔بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ جس طرح کے لوگوں میں بیٹھتے

ہیں خود کو اُنہی میں ڈھال لیتے ہیں۔کبھی مسجد و مدرسے میں علماء سے مناظرے کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی اپنے ہم عصر رفقاء میں علمی موشگافیاں کرتے ،کبھی شعر و نثر کی نوک پلک سنوار رہے ہوتے ہیں تو کبھی کمپیوٹر اور انٹر نیٹ کی جدید دنیا میں اپنے فن کا لوہا منواتے نظر آتے ہیں۔کبھی مشاعروں اور ادبی تقریبات کی زینت ہیں تو کبھی مسجد کے کسی کونے میں ہمہ تن گوش برآواز۔۔۔۔

میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ جس طرح ابتدأ مدرسہ کے ساتھ وابستہ تھے یہ وابستگی اگر یوں ہی جاری رہتی تو ایک متبحر عالم ہوتے۔شعبہ سپورٹس کے ساتھ جس طرح پینتیس سال گزارے اگر ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ان کو مواقع میسر آتے تو عالمی سطح پر نمائندگی اور کوچنگ کر رہے ہوتے۔فن خطاطی اور مصوری میں جس طرح وہ کینوس پر رنگ و خیال بکھیرتے ہیں اگر اسی شعبہ کے ہو کر رہتے تو شاندار مستقبل کے ضامن ہوتے۔ایک ہی شخص میں ایک سے زائد شعبوں کا کمال ہونا خالق یہ کرم فرمائی کسی کسی پر کرتا ہے۔

پروفیسر شفیق راجا محض ایک شاعر،ادیب اور استاد ہی نہیں بلکہ پورا ایک عہد اور عہد ساز شخصیت بھی ہیں۔اُن کی شخصیت اور کام کے فنی اور ادبی محاسن کا احاطہ کرنا محققین اور ناقدین فن کا کام ہے مگر جو چیز شفیق راجا کو اُن کے ہمعصر اور اہل علم سے جدا کرتی ہے وہ اُن کا زندگی کے بارے تصور ہے۔اُنھیں اپنی دھرتی،اپنی تہذیب و ثقافت اپنے دین اور نبی سے محبت ہے۔اُن کی تصنیف نعت کا سفر محض نعت کی تاریخ پر مبنی نہیں بلکہ عہد جدید میں تصور نعت کے انحطاط پر ایک بند باندھنا اور میدان نعت میں طبع آزمائی کرنے والے نعت خوانوں کو بارگاہ رسالت کا تقدس واحترام اور مقام و مرتبہ سمجھانا بھی ہے۔اُجلی دھرتی سچے لوگ اُن کی اپنی تہذیب اور اپنی مٹی سے محبت کا والہانہ اظہار ہے۔عشق دم جبرئیل میں بارگاہ ایزدی اور بارگاہ رسالت سے اپنی قلبی وابستگی کا اظہار کہیں تو اپنے نام اور کہیں اُن عشاق کے الفاظ و خیالات سے کرتے نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی زندگیاں عشق حقیقی کی تلاش و تگ و دو میں تمام کیں۔

اس معاشرے میں رہتے ہوئے مجھے جتنے بھی لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی سے متاثر ہوتے نظر آتے ہیں۔پروفیسر شفیق راجا کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے متاثر نہیں ہوتے۔یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی جہاں بھی کسی محفل میں جاتے ہیں دوسرے اُن سے مرعوب ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔میں یہ

نہیں کہتا کہ اُن کو تمام علوم پر مکمل عبور حاصل ہے مگر جو جو چیز اُن کے مطالعے سے گزری ہے ان کے حافظے کا حصہ بنی ہے جسے وہ بوقت ضرورت بڑی خوش اسلوبی سے استعمال کر کے اپنا شخصی تاثر قائم رکھتے ہیں۔ اپنی مدت ملازمت کے دوران جہاں جہاں رہے جس سے ملے ان کے نام، خاندانی پس منظر آج بھی ان کو اسی طرح ازبر ہے یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی سے ملتے ہیں تو اس اعتماد سے گفتگو کرتے ہیں جیسے اُسی کے گاؤں یا قبیلے سے تعلق ہو۔

جو آدمی کبھی ان سے ملا نہیں اس کی شاید ان کے بارے میں یہ رائے ہو کہ وہ خشک مزاج شخص ہیں مگر حقیقتاً جس کو ان سے قریب رہنے کا موقع ملا وہ ان کے شخصی کمالات کا معترف ہے۔ دوران تدریس اگر طلبہ کو ان سے کوئی شکایت رہی تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ان کی علمی سطح نصابی تقاضوں سے بہت بالا ہے طلبہ کے لیے جس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ میں نے ادبی دنیا میں بڑے بڑے اساتذہ کو دیکھا ہے جو اپنی ذات میں ایک انجمن ہوتے ہیں، ان کا ادبی کام بہت بڑا ہوتا ہے۔ ادبی حوالے سے بڑے مقام و مرتبے پر فائز نظر آتے ہیں مگر کمیاب ہو جاتے ہیں۔ ان سے استفادہ عام ممکن نہیں رہتا۔ ہاں جب دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں تو ان کے حوالے سے بڑے بڑے ریفرنسز، سیمینار اور کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں۔

پروفیسر شفیق راجا اس حوالے سے خوش قسمت ہیں کہ وہ اپنی ذات میں انجمن ہوتے ہوئے استفادہ عام کے لیے ہمہ وقت دستیاب ہیں۔ انھوں نے محض اپنی ذات کی پروجیکشن نہیں کی ہے۔ بلکہ ایک انجمن بنا کر خود اس کے سرخیل اور محور و مرکز کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس سال کی دنیا کی بہترین ٹیچر کا ایوارڈ حاصل کرنے والی ٹیچر اگر معاشرے کو ہر سال صرف ۳۵ طالب علم ہی نہیں دیتی بلکہ بہترین رائٹر اور تھنک ٹینک دے رہی ہے تو بلا شبہ شفیق راجا اپنے استاد اور مربی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے معاشرے میں پڑھے لکھے بیروزگار پیدا کرنے کی بجائے وہ فعال اور بہترین دماغ دے رہے ہیں جو اس ریاست کے طول و عرض میں اپنے علمی کمالات دکھا رہے ہیں اور شعور و آگہی کے اس سفر میں اپنے اپنے حصے کی شمعیں روشن کر رہے ہیں۔

☆☆☆

راجا تھا اپنے من کا

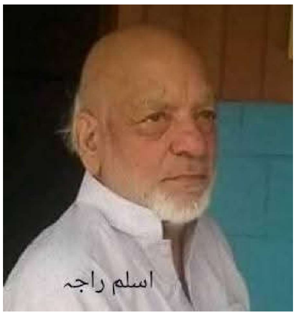

کتابیں پڑھنے کا شوق سکول کے زمانے سے ہی کچھ ایسے دل ودماغ میں رچ بس گیا تھا کہ کتاب خوانی کے بغیر جی کسی کام میں لگتا ہی نہیں تھا۔ جب کالج میں داخلہ لیا تو وسیع وعریض عمارات کشادہ کھیل کا میدان اور بڑی سی کالج کی لائبریری نے تو سچ میں ہی دل کو شاد کر دیا۔ دل تو کر رہا تھا ساری کتابیں یک بارگی ختم کر لی جائیں مگر لائبریرین صاحب کے حکم سے ''ایک وقت میں صرف ایک کتاب'' جاری کی جائے گی کہ حکم پر عملدرآمد کرنا پڑا۔ ایک دن لائبریری میں کیٹلاگ کارڈز میں سے اپنی پسند کی شاعری کی کتابیں تلاشتے ہوئے ''کونپل کا بدن''، ''اسلم راجا ''اور''باغ" نے ہمارے ہاتھ روک لیے۔ فوراً کیٹلاگ کارڈ ''خواجہ عبدالغنی'' لائبریرین ادارہ کے ہاتھ میں جا تھمایا اور تھوڑی ہی دیر میں کتاب ہمارے ہاتھ میں تھی۔ اب جو پڑھنا شروع کی تو ہر شعر اور ہر نظم دل میں اترتی چلی گئی۔ یوں اسلم راجا سے ہماری پہلی ملاقات کونپل کا بدن کے توسط سے ہوگئی۔ کتاب پڑھتے ہوئے یہ بھی پتہ چلا کہ اختر شیرانی کی عذرا اور۔۔۔۔۔ کی طرح اسلم راجا کی بھی کوئی رخسانہ اور کوئی بے نام اشعار کے پردوں میں نہاں پکار پکار کر اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہے۔

یہی وادی ہے وہ وادی جہاں رخسانہ رہتی تھی
وہ تھی نازوں کی پالی اور سدا شاہانہ رہتی تھی
قیامت خیز جوبن میں وہ بے باکانہ رہتی تھی
سرور و کیف میں مستی میں وہ مستانہ رہتی تھی

خیال آیا کہ اگر یہی وادی ہے وہ وادی جہاں رخسانہ رہتی تھی تو اب رخسانہ کہاں رہتی ہے اور رخسانہ کا ''رخسان'' اسلم راجا کہاں رہتا ہے۔ تو معلومات لینے پر پتہ چلا کہ شہر باغ کی پہلی شعری تصنیف کونپل کا بدن تخلیق کرنے کے بعد اب موصوف کراچی میں ہوتے ہیں۔

اسی کتابی ملاقات سے اسلم راجا کے ساتھ اصل ملاقات میں ڈیڑھ عشرہ گزر گیا اور جب پروفیسر

شفیق راجا کے توسط سے ملاقات ہوئی تو پہلی ہی نظر میں اُن کے شخصی آثار سے اُن کی شخصیت اور وجاہت کا اندازہ ہوا جو ماضی کے دھندلکوں اور گردشِ ایام میں دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔

دراز قد، چھریرا بدن، آنکھوں میں بلا کی چمک کلین شیوان کی تصویروں میں دیکھی ہوئی شخصیت جس میں پیچھے کی طرف پھرے ہوئے چمکدار بال اور سفاری سوٹ تھا کے برعکس سر مکمل ''فارغ البال" اور سوٹ کی بجائے شلوار قمیص اور سیاہ واسکٹ (جو ہمارے کم از کم ادنیٰ درجے کے مسلمان ہونے کی علامت ہے) میں ملبوس سینہ بھرپور نمایاں اُن کی شخصیت کو مل کر رعب دار بنا رہے تھے۔

یہ اسلم راجا وہی تھے جن کو پروفیسر شفیق راجا نے اپنی کسی تحریر میں ''باغی شاعر" کا لقب دیا تھا۔ جی ہاں وہی باغی شاعر جس نے باغ سے ''پہلا صاحب دیوان شاعر'' ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا اور وہی باغی شاعر جس نے رسوم ورواجات کے خلاف بھی عمر بھر علم بغاوت بلند رکھا۔ یہ وہی اسلم راجا تھے جو باغ کالج کا قیام 1967ء کی پہلی کلاس کے طالب علم تھے اور پہلی کلاس میں ہی شفیق راجا اور الطاف عاطف کے ساتھ مل کر پروفیسر عبدالعلیم صدیقی جیسی علم وادب دوست شخصیت اور ماہر اقبال کی زیر نگرانی شعر وادب کی وادی میں داخل ہوئے۔

شفیق راجا اور اسلم راجا نے ستر اور اسی کی دہائی میں موٹر سائیکل پر آزاد کشمیر بھر میں مشاعروں میں شرکت کر کے اس آزاد خطہ میں مشاعروں کی روایت اور شعر وادب کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ شفیق راجا اور الطاف عاطف تصنیفی اعتبار سے احتیاط پسند واقع ہوئے اور پہلی تصنیف لانے کی جرات نہ کر سکے مگر اسلم راجا کی باغی طبعیت 1984 میں ''کونپل کا بدن" کی صورت میں منصۂ شہود پر آ گئی اور یوں وہ خطہ باغ کی پہلی شعری تصنیف کہلائی - پروفیسر شفیق راجا نامور مصنف اور مورخ محمود آزاد کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سید محمد آزاد نے اپنے ساتھ ہونے والی ملاقات میں مجھے کہا کہ ''جب تم باغ گئے تو اسلم راجا کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ اسلم راجا مر جائے گا مگر کونپل کا بدن زندہ رہے گی اور اسلم راجا کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔''

اسلم راجا نے تعلیم سے فارغ ہو کر کراچی کو اپنا مسکن بنایا اور اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ کراچی اور

دیارِ غیر میں گزارا۔ کراچی میں قیام کے دوران کارِ روزگار کے ساتھ ساتھ اپنے شوق کی تکمیل میں بھی سرگرداں رہے۔ یہ شوق کبھی تو انھیں ادبی شخصیات کے پاس اور کبھی وہاں کے مشاعروں اور ادبی محافل تک لے جاتا۔ اس طرح جہاں فکرِ معاش کی ضروریات پوری ہوتی رہیں وہیں اس وابستگی نے ان کی شعر فہمی کی صلاحیت کو دو چند کیا اور شعر اور فنِ شعر میں کمال عطا ہوا۔ ان کی نستعلیق شخصیت اور لہجہ ان کی اسی کراچی کی ادبی وابستگی کا غماز تھا۔

ایک عرصہ تک کراچی میں رہنے کے بعد فکرِ معاش کی یہی ضرورت اور بہتر روزگار کی تلاش انہیں کراچی سے سرزمینِ حجاز تک لے گئی۔ دیارِ غیر میں اگرچہ ادبی ماحول نہ ہونے کے برابر تھا اور کراچی کے مقابلے میں تو بالکل بھی نہیں تھا اس کے باوجود ان کی شعر و ادب سے لگن اور وابستگی ان کے شوق کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی اور اپنے کام کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں اپنی کتاب بنی اور شعر و ادب کے ذوق کی آبیاری ہوتی رہی۔ ان کی شاعری اور دیگر تحریریں وہاں کے مختلف اُردو اخبارات اور جرائد کی زینت بنتی رہیں اور یوں ان کے شوق کی تکمیل ہوتی رہی۔

پیرانہ سالی کے باعث دیارِ غیر سے وابستگی ہوئی اور یوں ان کی زندگی کا باقی عرصہ باغ میں گزرا۔ ابتدائی عرصہ میں تو معمول یہ تھا کہ روزانہ ہی باغ شہر کا چکر لگتا اور ابرار یونس کی دکان ان کا ٹھکانہ ہوتا جہاں سے دیگر دوستوں کے ساتھ باقاعدگی سے ملاقات ہوتی۔ اب کے یہ ملاقاتیں طلوعِ ادب کے ساتھ ان کی وابستگی کا ذریعہ بنتی چلی گئیں۔ پندرہ روزہ تنقیدی نشستوں، ماہانہ ادبی نشستوں اور مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے۔ ان کی آمد سے طلوعِ ادب کی ادبی نشستیں اور بھرپور ہوتی گئیں اور نوواردانِ ادب کے لیے ان کے علم اور تجربے سے کسبِ فیض کا زیادہ موقع میسر آتا۔ شفیق راجا، اسلم راجا اور الطاف عاطف تینوں ہم جماعتوں کی شمولیت سے کلاس کا سا ماحول بنتا، پرانے واقعات زیرِ بحث آتے اور خوب جگتیں چلتیں۔ شعر و ادب پر بات ہوتی، فنِ عروض زیرِ بحث آتے، نئے ادبی رجحانات گفتگو کا موضوع بنتے۔

بڑھتی عمر اور گزرتے وقت کے ساتھ اسلم راجا کو صحت کے مسائل کا سامنا ہونے لگا۔ پہلے پہل دور تک دیکھنے کی صلاحیت متاثر ہوئی تو عینک کے ذریعے اس مسلہ کا جزوی حل نکالا گیا۔ کچھ وقت گزرا تو ثقلِ

سماعت آڑے آنے لگی اور اس کا حل کان میں آلہ سماعت لگا کر کیا گیا۔آخری عرصہ میں بصارت اور سماعت کی کمی کے ساتھ ساتھ بلند فشار خون(Blood pressure) اور مٹھاس خون(Diabities) بھی غیر محسوس طریقے سے صحت پر اثر انداز ہونے لگا ۔کرتے کرتے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان آلات کی موجودگی اور باقاعدگی سے ادویات کے استعمال کے باوجود مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کہ مصداق امراض اور بھی پیچیدہ تر ہوتے چلے گئے۔

کان آلہ سماعت کی موجودگی میں بھی اب سننے سے قاصر ہو گئے تھے۔مخاطب کچھ اور بات کرتا اور وہ کچھ اور سمجھتے یا اندازے سے سمجھ کر جواب دیتے۔ایک بار تنقیدی نشست میں ان کی غزل تنقید کے لیے پیش ہوئی۔جن صاحبان نے ان کی غزل پر تنقید کی اور اُسے کمزور غزل قرار دیا اسلم راجا نے سمجھا کہ وہ میری تعریف کر رہے ہیں اس لیے بہت خوش ہوئے۔ایک صاحب نے ان کی غزل کی بہت تعریف کی ۔جانے اسلم راجا کے ذہن میں کیا خیال آیا وہ سمجھے کہ یہ مجھ سے چھوٹا ہو کر مجھ پر تنقید کر رہا ہے۔ایک دم کھڑے ہو گئے کہ ''یہ ٹکے ٹکے کے لوگ اب اسلم راجا کی شاعری پر تنقید کریں گے''۔محفل میں ہنس ہنس کر سب کا برا حال ہو گیا مگر ان کو کون سمجھائے کہ اصل ماجرا نقاد کی تنقید نہیں ان کی ثقل سماعت ہے۔

ان کے کلاس فیلو الطاف عاطف بھی ''ثقلِ سماعت" کا شکار تھے اور وہ بھی آلہ سماعت کا استعمال کرتے۔ایک ادبی نشست میں دونوں صاحبان آپس میں کسی بات پر بحث کرنے لگے۔اب اسلم راجا بھی وہی بات کر رہے ہیں اور الطاف عاطف بھی۔ایک بھی دوسرے کی بات نہیں مان رہا اور دوسرا بھی------ آوازیں اونچی ہو رہی ہیں ایک بھی چپ نہیں کر رہا۔سامعین سب ہنس رہے ہیں،ایک صاحب اسلم راجا کے پاس گئے اور ان کے کان میں بلند آواز سے کہا کہ آپ دونوں ایک ہی بات کر رہے ہیں اختلاف رائے نہیں کر رہے اس لیے اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔کہنے لگے اچھا میں سمجھا یہ کیپٹن میرے خلاف بات کر رہا ہے اس لیے اس کو جواب دینا ضروری تھا۔جب الطاف عاطف کو کان میں بات سمجھائی تو وہ کہنے لگے غلطی میری ہی ہے کہ میں آج غلطی سے ''دوسری مشین'' کان میں ڈال آیا ہوں اس میں تو سوائے شور کے کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔

اسلم راجا کو پنے راجا ہونے پر بڑا زعم تھا اور وہ اس پر ہمیشہ اس پر نازاں رہتے ۔ اپنے قبیلے کی اسی شان اور عظمت کے حوالے سے تحقیق و تدقیق کے عمل سے گزرے تو ''تاریخ نارمہ'' لکھ کر شجرہ نسب پر کھوں سے جاملایا۔ اس تحقیقی کاوش کے منظر عام پر آنے کے بعد ان کا خیال تھا کہ ان کو اس شاندار علمی کام پر کم از کم ان کے خاندان والوں کی طرف سے بہت سراہا جائے گا لیکن صورت حال اس کے برعکس ٹھہری۔ سراہنا تو درکنار ان کے خاندان نے عملاً ان کی کتاب خریدنے کے حوالے سے اور کسی تقریب پذیرائی کے حوالے سے جس سرد مہری کا مظاہرہ کیا اس پر وہ ہمیشہ شاکی رہے۔ ان کا یہ گلہ تھا کہ اسلم راجا اگر کسی اور قبیلے میں پیدا ہوا ہوتا تو وہ اُس کی شخصیت اور فن کی قدر کرتے مگر ان کے قبیلے نے اُن کی تاریخ نارمہ کو بھی وہ اہمیت نہیں دی جس اہمیت کی وہ حقدار تھی۔ بلاشبہ ان کی اس بات میں حقیقت بھی تھی کہ ان کے گھر سے ان کے قبیلے تک کوئی ایک بھی ایسا سخن شناس سامنے نہ آسکا جو ان کے فن کا قدر شناس ہوتا۔

آخری چند سالوں میں خون میں بڑھتی ہوئی مٹھاس نے جہاں ان کے کھانے پینے کو محدود کیا وہیں شدتِ فشارِ خون اور اضافی مٹھاس کے باعث ان کے پاؤں خراب ہونے لگے جو بعد ازاں قطع و برید کے عمل سے گزر کر ان کو بستر تک محدود کر گئے۔ ہم جب بھی ان سے ملنے جاتے بہت خوش ہوتے کہ میری حقیقی اولاد سے بڑھ کر آپ میری اور میرے فن کی قدر کرتے ہیں اور باقاعدگی سے میرے پاس آتے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات اور ادبی کام کے پیش نظر ادبی میگزین 'مطلع' کے لیے ان کا انٹرویو کرنے کا سوچا تو سوالنامہ ان کو لکھ کر دیا جن کا انھوں نے بڑی تفصیل سے جواب دیا۔ بعد ازاں جب ان کا انٹرویو چھپا تو بہت خوش ہوئے کہ جو کام میری اولاد اور خاندان کو کرنا تھا وہ آپ کرتے ہیں اور میری اور میرے فن کی اس طرح حوصلہ افزائی اور قدر کرتے ہیں۔

عمر کے آخری عرصہ میں ہماری ان سے ملاقاتیں اکثر یک طرفہ ہی ہوتی تھیں وجہ یہ تھی کہ وہ صرف سنا سکتے تھے سن نہیں سکتے تھے اور ہم ٹھہرے احترام کے مارے ان کی ہر بات کو بڑے احترام سے سنتے اور سر ہلاتے۔ یوں وہ بہت خوش ہوتے کہ کوئی ایسا بھی ہے جو اس قدر انہماک اور یکسوئی سے مجھے سنتا ہے اور کسی بات کی نفی نہیں کرتا۔ کوئی لطیفہ سناتے تو اس پر خوب ہنستے اور ہنساتے اور اس بات پر جی ہی جی میں بہت خوش ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ پیرانہ سالی میں جب اپنی اولاد بھی اجنبی بن جاتی ہے اور اپنے بزرگوں کو گھر میں پڑے ہوئے اضافی سامان سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی اور ان کے کھانے پینے کے اوقات میں ان کی اس ضرورت کو پورا کر کے یہ سوچتی ہے کہ ہم نے ان کا حق ادا کر دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے اور ہمارے وہ بزرگ جو ایک بہترین متحرک عملی زندگی گزار چکے ہوتے ہیں ان کا اچانک یوں بستر سے جا لگنا اور تنہائی کا شکار

ہو جانا ان کے لیے کس حد تک تکلیف دہ ہوسکتا ہے اس کا اندازہ ہم میں سے کوئی صحت مند آدمی نہیں کر سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے کسی سینما میں دس منٹ کی ایک ٹیلی فلم پیش کی گئی جس کے پہلے منظر میں چھت پر چلتا ہوا ایک پنکھا دکھایا گیا جس میں پنکھے کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پہلا منٹ گزرا ناظرین کو بوریت ہونے لگی، دوسرا، تیسرا، چوتھا حتیٰ کہ نویں منٹ تک ایک ہی پنکھا چلنے کا منظر تمام ناظرین کو اکتا گیا اور وہ اب اُٹھ اُٹھ کر باہر جانے لگے تھے اور اپنے تئیں فلم ڈائریکٹر کو کوس رہے تھے کہ یہ کیسی فلم ہے جس کے نو منٹ ڈائریکٹر نے ایک ہی پنکھا چلنے کے منظر پر ساکت کر کے گزار دیے اور یہ کسی قدر فضول اور بے کار فلم ہے کہ اچانک دسویں منٹ میں کیمرا گھوما اور منظر بدلا اور اگلے منظر میں پنکھے کے عین نیچے بیڈ پر ایک بوڑھا بیمار شخص پنکھے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا دکھائی دیا۔ فلم کے پس منظر سے آواز سنائی دی کہ جس منظر کو آپ ناظرین دس منٹ برداشت نہیں کر سکے ہیں وہ منظر میں پچھلے دس سال سے بے حس وحرکت لگا تاریوں ہی دیکھ رہا ہوں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صاحب فراش ہونا وہ حقیقت ہے جس سے اعراض نہیں کیا جا سکتا اور نہ جھٹلایا جا سکتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی کبھی بھی متحرک عملی زندگی سے یک دم ساکت اور جامد زندگی میں جا سکتا ہے۔ ایسے میں اگر اس کی تنہائی کو بانٹنے کی بجائے اگر حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے تو وہ شخص وقت سے پہلے مر جاتا ہے۔ اسلم راجا اسی کیفیت سے گزر رہے تھے، ایک بھر پور متحرک زندگی گزارنے والے اسلم راجا کے لیے یک دم بستر سے یوں جا لگنا ان کے لیے کس قدر اذیت ناک تھا یہ ہم صرف اندازہ ہی لگا سکتے تھے۔ اس لیے ان کے لیے ہم جیسے کسی بھی فرد کی موجودگی کسی نعمت عظمیٰ سے کم نہیں تھی اور ہماری اس موجودگی سے وہ بھر پور لطف بھی اٹھاتے تھے۔ انھوں نے اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود اسی حالت میں اپنی دوسری بیاض مکمل کر لی تھی اور آخری عرصہ میں یہ شعری مجموعہ چھپوانا چاہتے تھے۔ ہم نے اُسے کمپوز کرایا ترتیب دیا مگر ان کی بگڑتی ہوئی طبعیت کے باعث یہ خواب ان کی زندگی میں شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

☆☆☆

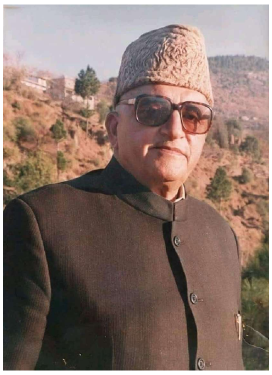

علمدارِ ختم نبوت

کیسی کیسی نابغہ روزگار ہستیاں اس شہر کی رونق ہوا کرتی تھیں جن سے یہ شہر آباد تھا۔ کیسے کیسے لوگ تھے جن سے یہ شہر ہر وقت بارونق رہا کرتا تھا، جن سے اس شہر کے ہوٹل آباد تھے، جن کی آمد و رفت سے رات میں دن کا گمان ہوتا تھا۔ جو جب شہر میں نکلا کرتے تو ہر طرف ایک چہل پہل شروع ہو جاتی۔ کس کس کا نام لیا جائے کس کس کو بیاں کیا جائے، ایک سے بڑھ کر ایک اور اچھے سے اچھے۔ بچوں سے لے کر بڑے تک اور امیر سے غریب تک جن کے گرویدہ تھے۔ سابق سپیکر قانون ساز اسمبلی آزاد کشمیر میجر (ر) سردار محمد ایوب خان بھی انہی چنیدہ لوگوں میں سے ایک تھے۔ وہ سردار محمد ایوب خان جو اپنی ذات میں ایک انجمن تھے بہترین مدبر، مقرر، معاملہ فہم، مصالحت پسند اپنی شخصیت کے ہر پہلو میں اتنے کثیر الجہت کہ اگر ان کی شخصیت کا کوئی ایک پہلو نہ بھی ہوتا تو دوسرا پہلو اُن کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوتا۔

ان کی اس حیات عارضی کے کئی دور چشم فلک نے دیکھے، پہلا وہ دور تھا جب لڑکپن اور جوانی کی دہلیز پر ان کو تحریک آزادی کشمیر کے دوران اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ فطرت خود کرتی ہے لالے کی حنا بندی کے مصداق فطرت نے ان کے لیے حالات کچھ اس طرح ساز گار کیے کہ باغ سیکٹر کو ڈوگروں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے با قاعدہ رضا کار فوج بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ ڈوگرہ مسلح فوج کے خلاف سینہ سپر ہونے کے لیے ان سیکٹر کمانڈروں کے پاس مسلح جدوجہد کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ہاڑی گہل کے مقام پر باقاعدہ بھرتی سینٹر قائم کیا گیا اور باغ بٹالین ون کے نام سے پہلی بٹالین کھڑی کی گئی۔ برطانوی ہند کی فوج کے تجربہ کار افسروں اور سپاہیوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ان مجاہدین کی تربیت کا بندوبست کریں۔ اسی رضا کار فوج نے بعد ازاں اس خطہ کی آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔

سردار محمد ایوب خان نے ان مہمات میں جرات و بہادری کے بھرپور جوہر دکھائے اور اعلیٰ کمان کی

طرف سے اپنے اس انتخاب کو درست ثابت کر کے دکھایا۔ سیاسی افراتفری اور انارکی کے ماحول میں جب سب کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ کشمیر کا مستقبل کیا ہوگا اس کا کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ بس ایک عزم مسلسل اور جذبہ جہاد تھا جس نے مٹھی بھر مجاہدین کو باقاعدہ تربیت یافتہ مسلح ڈوگرہ اور ہندوستانی فوج کے سامنے لا کھڑا کیا۔ یہ ان نہتے مجاہدین کا جذبہ جہاد اور بہترین قائدانہ صلاحیتوں کے حامل قائدین ہی تھے کہ جن کی زیر قیادت اس ساری جدوجہد آزادی کا نتیجہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی آزادی کی صورت میں یہاں کے باسیوں کو میسر آیا۔

جب تحریک آزادی کشمیر کے دوران کشمیر کی آزادی کے لیے مری میں سپریم وار کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا اور باغ سیکٹر کی کمان سردار محمد عبدالقیوم خان کے سپرد ہوئی تو سردار صاحب نے بغیر کسی تاخیر کے آپریشنل سرگرمیوں کا آغاز کیا اور خود بطور بریگیڈ ئیر بھرتی اور دیگر فوجی نظم کو ترتیب دے کر عسکری سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مسلح تحریک آزادی میں جب باغ میں باقاعدہ رضا کار فوج ترتیب دی گئی اور باغ بٹالین کے نام سے بھرتی شروع کی گئی تو سردار محمد ایوب خان نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پونچھ سیکٹر میں مجاہد وطن کے طور پر ان کی دلیرانہ خدمات دیکھی جائیں تو باقی سارے کارنامے ہیچ دکھائی دیتے ہیں۔ ایریا کمانڈر کی حیثیت سے رضا کار فوج کی قیادت کرتے ہوئے ڈوگرہ فوج کے خلاف بھرپور کارروائیاں کیں اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایریا کمانڈر کے طور پر حاجی پیر کے محاذ پر ہندوستانی فوج کا بھرپور مقابلہ کیا اور ان کا حملہ ناکام کر کے اس محاذ کو مضبوط بنایا۔ پیر کنٹھی کے محاذ پر دشمن کے تابڑ توڑ حملوں کے جواب میں ایسی حکمت عملی اپنائی کہ دشمن کو منہ کی کھانا پڑی۔

تحریک آزادی کے اختتام پر آپ نے باقاعدہ پاک فوج میں شمولیت اختیار کر لی اور مختلف عسکری عہدوں پر تعینات رہے۔ ان کے عرصہ ملازمت کے دوران ہی ہندوستان نے پاکستان کے ساتھ ایک بڑی جنگ چھیڑ دی۔ 1965ء کی اس پاک بھارت جنگ میں اہل وطن کا جذبہ جہاد دیدنی تھا۔ کوئی بھی ایسا فرد وطن عزیز میں نہیں رہا ہوگا جس نے اپنی افواج کے شانہ بشانہ اس بھارتی مہم جوئی کا بھرپور جواب نہ دیا ہو۔ سردار محمد ایوب خان نے اس جنگ میں حصہ لیا اور مختلف محاذوں پر اپنی صلاحیتوں کے بھرپور جوہر دکھائے۔ مدت ملازمت کی تکمیل کے بعد بطور میجر عسکری خدمات سے سبکدوش ہوئے اور سماجی خدمات کے لیے خود کو وقف کر

دیا۔

انہی سماجی خدمات کے تسلسل میں 1970ء میں میدان سیاست میں قدم رکھا اور اپنی سیاسی اور سماجی خدمات کے لیے اس طرح نظم کے ساتھ کام کیا کہ اگلی تین دہائیوں تک ان کے آبائی حلقے میں کوئی دوسرا ان کی جگہ نہیں لے سکا۔ تین دفعہ براہ راست انتخاب کے ذریعے حلقہ شرقی باغ سے اسمبلی ممبر منتخب ہوئے جبکہ ایک بار کشمیر کونسل کے ٹکٹ پر بلا مقابلہ منتخب ہو کر عوامی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ قانون ساز اسمبلی کے پلیٹ فارم سے جس طرح اپنے پیشے اور عہدے کے مطابق کام کیا وہ ان کی شخصیت کا خاصا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد بننے والی نئی مملکت خداداد پاکستان میں قادیانی مسئلے نے سر اُٹھایا تو پاکستان میں اس کے جواب میں تحریک ختم نبوت شروع ہوئی جس میں پاکستان کے چوٹی کے علماء شامل تھے۔ 1950ء سے 1970ء کی دہائیوں میں اس تحریک نے بہت زور وشور سے ملک کے طول وعرض میں اپنی سرگرمیوں سے عام آدمی کو اس بڑے فتنہ سے آگاہ کرنے کے لیے اہم کردار ادا کیا مگر عملاً کوئی ایسا قدم نہ اُٹھایا جا سکا جس سے اس فتنہ کا باقاعدہ سد باب ہو سکتا۔ اس کا اولین سہرا اُس وقت کی آزاد حکومت کے سر جاتا ہے جس کے سرخیل یہی سردار محمد ایوب خان تھے جنہوں نے اسمبلی ممبر کی حیثیت سے عام آدمی کی اس آواز کو قانونی شکل دینے کے لیے 29 اپریل 1973ء کو قانون ساز اسمبلی آزاد کشمیر میں قرارداد ختم نبوت پیش کی جسے لمبی بحث وتمحیص کے بعد بھاری اکثریت سے اسمبلی سے منظور کروا کر وہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔

یہ ایک ایسا کام تھا جو قدرت نے ایک ایسے وقت میں ان سے لیا جس کی اہمیت کا کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا لیکن اس ایک فیصلے نے ان کو علمدار ختم نبوت کے منصب پر جا پہنچایا۔ سردار محمد ایوب خان نے ساری زندگی اگر کچھ نہ کیا ہوتا اور صرف یہی ایک کام کیا ہوتا تب بھی ان کو اس فانی دنیا میں باقی رکھنے کے لیے یہی ایک کام کافی تھا۔ اس قرارداد کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی قومی اسمبلی نے اسی قانون کی طرز پر اگست 1973 میں 73ء کے آئین کے تحت قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔ اسی طرح سردار عبدالقیوم خان کے دور حکومت میں آزاد کشمیر میں نفاذ شریعت بل کی منظوری کے حوالے سے بھی آپ کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔

ان کی ساری زندگی میں نامساعد حالات کے باوجود قدرت ہمیشہ ان پر مہربان رہی۔اس کا اندازہ ان کی زندگی کے ان مختلف ادوار سے لگایا جاسکتا ہے جس میں وہ مختلف حالات میں مختلف قسم کی صورت حال اور حالات کے ساتھ برسر پیکار رہے اور آخر کار سرخرو ٹھہرے۔البتہ جنرل (ر) محمد حیات خان کے دور میں بحالی جمہوریت کی تحریک میں آپ کو کچھ اس انداز سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ آپ کو قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ان حالات میں بھی آپ کے پایہ استقلال میں کمی نہیں آئی اور وہ اپنے موقف پر برابر قائم رہے۔یہ کوششیں بالآخر بارآور ہوئیں اور اس ساری جدوجہد کے نتیجے میں بالآخر آمریت کے دور کا خاتمہ ہوا۔

میجر (ر) سردار محمد ایوب خان نفیس شخصیت کے مالک تھے۔ان کی شخصیت کی یہ نفاست اور انفرادیت عمر بھر ان کی ذات کی حصہ رہی جس میں عمر بھر کبھی کمی نہیں آئی۔جو انداز رہن سہن، نشست و برخاست، لباس و خوراک اوائل عمر میں ان کی ذات کا حصہ بنا اسے پھر کبھی خود سے دور نہیں جانے دیا۔ہمیشہ تازہ کلین شیو رہنا، سر پر قراقلی یا ٹوپی پہننا، عموماً اجلا سفید استری کیا ہوا لباس پہننا جس پر کبھی سلوٹوں کی نشان نہیں، دھیمی چال چلنا اور چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رکھنا یہ ان کی شخصیت کے وہ اوصاف تھے جو عمر بھر ان کی ذات کا حصہ رہے۔ان کی شخصیت میں میں وہ کشش تھی جس کی وجہ سے دوسرا ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتا۔وہ جب بازار میں نکلتے تو کبھی اکیلے نہ ہوتے بلکہ ان کی اردگرد کئی لوگ ہوتے۔یہ ان سے مطلب یا غرض رکھنے والے نہیں بلکہ عموماً وہ لوگ ہوتے جو ان سے عقیدت رکھتے تھے جن کو ان سے کوئی کام یا غرض نہ ہوتی۔

میری اُن سے بہت سی ملاقاتیں رہیں، اُن کا انداز بڑا دلفریب اور ذہانت لاجواب تھی۔تحریک آزادی کشمیر کے حوالے سے جب واقعات کا تذکرہ کرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسا کہ سننے والا ان واقعات کو آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھ رہا ہے۔ان کا حافظہ بہت قوی اور یادداشتیں لاجواب تھیں۔اگر کارزار سیاست میں پڑنے کی وجہ سے مصروف نہ ہوتے اور کوئی ان کی یاداشتوں کو باقاعدہ طور پر جمع کرتا تو یقیناً تحریک آزادی کے بہت سے ان گمنام گوشوں سے بھی پردہ اُٹھتا جو آج تک اوجھل ہیں۔ان کی یاداشتوں اور انداز بیاں کا اندازہ ان کی صرف اس ایک یاداشت سے کر سکتے ہیں جس کا حوالہ غازی محمد امیر نے اپنی تصنیف ''تاریخ

کشمیر‘‘ میں بہت سے واقعات کے عینی شاہد ریٹائرڈ میجر محمد ایوب خان کے باغ سیکٹر میں مجاہدین کی کارکردگی اور پیش رفت کے حوالے سے دیا ہے:

’’سردار محمد عبدالقیوم خان کی سرکردگی میں مجاہدین نے تھانہ دھیرکوٹ لوٹنے کے بعد جو اسلحہ حاصل کیا۔اسی اسلحہ سے باغ بٹالین (فورس) کی پہلی پلٹن کی بنیاد رکھی گئی جس کے سیکشن کمانڈر محمد سعید خان، محمد سلیم خان اور محمد صدیق خان مقرر ہوئے۔تقریباً دس دن کے اندر کچیلی کا مورچہ فتح کرلیا گیا۔بعد میں ناڑگا پہاڑ کا مشہور محاذ کھلا۔ان لڑائیوں میں باغ کے مجاہدین کے حوصلے بہت بلند ہوئے اور اسلحہ بھی ہاتھ آیا۔ڈوگرہ فوج کوہالہ پل کو اُڑا کر پاکستان کے ساتھ کشمیر کے براہ راست تعلق کو ختم کرنا چاہتے تھی اس مقصد کے لیے وہ اپنے ساتھ بارود بھی لائے تھے۔اگر مجاہدین بروقت کارروائی کر کے اس پل پر قبضہ نہ کرتے تو تحریک آزادی کو بہت بڑے دھچکے کا سامنا کرنا پڑتا۔کوہالہ پل صحیح سلامت مجاہدین کے ہاتھ لگا اس پر قبضہ کرنے کے بعد کوہالہ کے مقام پر ٹرانزٹ کیمپ اور سپلائی ڈپو بنایا گیا۔

جب باغ سیکٹر ہیڈکوارٹر ہاڑی گہل کے مقام پر قائم کیا گیا تو سب ادارے اس کے تحت آ گئے۔ راقم الحروف کو اس ایریا کی کمان سپرد کی گئی۔انڈین سگنل کور کے سابق حوالدار میجر شاہ میر خان ایڈجوٹنٹ مقرر ہوئے۔مسٹر علی افسر خان اور محمد سلیم خان دفتر کا کام چلاتے رہے۔بریگیڈیئر کی کمان پہلے سردار محمد عبدالقیوم خان خود کرتے رہے بعد میں انڈین نیشنل آرمی کے کرنل تجمل حسین خان آف کروٹ، راولپنڈی پونچھ محاذ پر بریگیڈ کمانڈر مقرر ہوئے۔

مجاہدین نے کوہالہ سے لے کر باغ تک ہر مقام پر ڈوگرہ فوج کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا جس کی وجہ سے اسے فرار ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ان معرکوں میں محمد سلیم خان (بعد میں میجر)، پیر علی اصغر شاہ، جمعدار محمد حیات خان (بعد میں میجر)، گل بادشاہ خان (بعد میں کیپٹن)، محمد امین خان، رنگباز خان اور حوالدار سلیمان خان اور دیگر بہت سے مجاہدین نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔‘‘

یہ اور اس طرح کے کتنے ہی ایسے واقعات تھے جو ان کو حرف بہ حرف از بر تھے جن میں سے چند ایک کو مختلف مورخین اور مولفین نے اپنی تصانیف میں نقل بھی کیا ہے۔عام حالات میں اگر آپ کا سفر آخرت ہوتا

تو ملک کے طول وعرض سے عوام اور خواص شریک ہوتے ،تعزیتی ریفرنس ہوتے ۔ان کی شخصیت اور فکر وفن پر اہل علم وقلم اظہار خیال کرتے مگر ایک ایسے وقت اور بقول غالب وبائے عام میں آپ اس دنیا سے رخصت ہوئے جب کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ ہر کوئی اپنے پیاروں کے غم میں اس طرح گم تھا کہ کسی کو اردگرد کی خبر نہ تھی ۔جب ہر گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی جب ہر ایک کا غم سب کا غم تھا اور سب کا غم ہر ایک کا غم تھا۔

اس روز بھی معمول کے مطابق صبح ہوئی ہر کوئی روز مرہ کے معمول کے مطابق اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ بازار سج گئے تھے، دفتر کھل گئے ،سکول کالج اپنے معمول کے مطابق چلنا شروع ہوئے، گھروں کے اندر کہیں کچھ لوگ سوئے کچھ جاگ چکے تھے۔رمضان المبارک کی آج تین تاریخ تھی سبھی نے سحری کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کے بعد دوبارہ سے عملی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ ملی جلی کیفیات تھیں جن میں سبھی اپنے اپنے معمولات کے ساتھ وابستہ خراماں خراماں آگے بڑھ رہے تھے۔

سب کچھ معمول کے مطابق تھا، کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے کہ اچانک دھرتی کانپ اُٹھی اور اگلے لمحے سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ وہ باغ جو ایک شہر ہی نہیں اپنے اندر ایک تاریخ بھی رکھتا تھا، وہ دھرتی جسے غازیوں اور شہدا کی سرزمین کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ جس شہر کو بسنے میں جانے کتنی صدیاں لگ گئیں، جس شہر نے اپنے باسیوں کے عروج وزوال کے جانے کتنے ادوار دیکھے ہوں گے، وہ شہر جس کے بارے میں لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا، وہ شہر جو جانیں کتنی ہی تہذیبوں کا مرکز رہا تھا۔ جی ہاں وہی باغ ......جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب...... جہاں آٹھ اکتوبر کی صبح تک تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا لیکن اس شام کچھ بھی ویسا نہیں تھا۔اختر رضا سلیمی نے کہا تھا کہ

پلک جھپکنے میں مسمار ہو گیا ہے رضا
وہ شہر جس کو زمانہ لگا بسانے میں

اسی شہر نے آج پلک جھپکتے اپنے باسیوں کو نگل لیا تھا۔آن واحد میں دس ہزار نفوس صرف اس ایک ضلع سے راہی ملک عدم ہوئے جبکہ زلزلہ سے متاثرہ دیگر اضلاع سے مرنے والوں کے جو اعداد وشمار اکٹھے ہوئے وہ اسی ہزار کے لگ بھگ تھے۔ وہ دفاتر جو ایک لمحہ پہلے تک ملکی نظم ونسق کے ضامن تھے کھنڈر بن گئے۔

وہ درسگاہیں جو معماران قوم تیار کر کے قوم کو دیتی تھیں آج انہی عمارتوں نے ان ننھی کونپلوں کو کھلنے سے پہلے ہی مسل کر رکھ دیا تھا۔ وہ شفاخانے جو زندگی کے ضامن تھے اور لوگوں کو زندگیاں دے کر لوٹایا کرتے تھے آج خود زندگی کے محتاج تھے۔ وہ گھر جو لوگوں کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے آج انہی گھروں نے اپنے مکینوں کو نگل لیا تھا اور کسمپرسی اور بے کسی کا یہ عالم تھا کہ:

بھونچال میں کفن کی ضرورت نہیں رہی
ہر لاش نے مکان کا ملبہ پہن لیا

آج آٹھ اکتوبر کے انہی کھنڈرات پر ایک نیا شہر آباد ہے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اجڑا ہوا یہ شہر پھر سے آباد ہو سکتا ہے۔ جو کل زلزلے میں اپنی پہچان گم کر بیٹھا تھا، جو معدوم ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر وہ شہر پھر سے آباد ہو گیا ہے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ چہل پہل دیکھنے کو مل رہی ہے۔ آبادی پہلے سے کہیں زیادہ، رونقیں پہلے سے دوبالا، سب کچھ پہلے سے زیادہ بہتر............ لیکن اگر نہیں تو وہ سب نہیں جو آٹھ اکتوبر کی صبح تک تو ہم سب کے ساتھ تھے مگر اس ایک ساعت میں ہم سے کہیں کھو گئے، کہیں گم ہو گئے......اس باغ سے باغ عدن یا پھر باغ فردوس میں......

☆☆☆

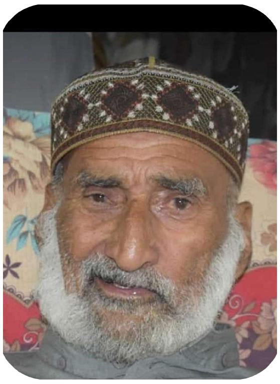

مردِ آہن

(Man of Steel)

میں نے اپنے والد کو سن شعور میں اُس وقت دیکھا جب وہ دو ہجرتوں کے ساتھ ساتھ اپنی پیشہ وارانہ عسکری ملازمت کو مکمل کر کے گھر آ چکے تھے۔ وہ اوران کا سارا خاندان تقسیم برصغیر کے ہنگامے میں اپنا سب مال واسباب اور حیثیت و جائیداد چھوڑ کر اپنے والدین اور سینکڑوں دیگر لٹے پٹے مسلمانوں کے ساتھ کئی ہفتوں کی مسلسل مسافت طے کرنے کے بعد مقبوضہ پونچھ کے ضلعی صدر مقام سے ہجرت کر کے نئی اوران دیکھی منزل واہ کینٹ موجودہ ٹیکسلا پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر محض دس سال تھی ۔ یہ وہ وقت تھا جب مہاجرین اور آبادکاروں کا ایک جم غفیر اس نوزائیدہ مملکت پاکستان پر ہر ایک سرحد سے لٹا پٹا پہنچتا اور زبان حال سے اپنی سفری صعوبتوں اور خود پر بیتنے والی ہزاروں داستانیں لیے عارضی کیمپوں کا مکیں بنتا۔

ایسا ہی ایک قافلہ انہیں اوران کے ساتھ سینکڑوں دیگر بے گھر اور بے سروساماں مرد وزن کے ساتھ اس نئی منزل کا مکیں ہوا۔ ابھی انہیں یہاں پہنچے اور قیام پذیر ہوئے چند ہی ہفتے گزرے ہوں گے کہ نامساعد حالات ، ناکافی خوراک، نامکمل انتظامات اور دیگر حفظان صحت کے مسائل نے آنے والے پناہ گزینوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وبائی امراض نے سینکڑوں گھروں کے چراغ گل کرنا شروع کر دیے۔ اس وبا کا شکار ہونے والوں میں ان کے والد اور بھائی بھی تھے۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ ایک طرف مہاجر کیمپوں کی ناگفتہ بہ حالت، اوپر سے فاقے اور بیماریاں اور رہی سہی کسر پے در پے اموات نے نکال دی تھی ۔ یہ چند سال کس طرح گزرے اور کن کن تکالیف اور مصائب کا سامنا رہا ان کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جو اس طرح کے حالات سے گزرا ہو۔ ایک طرف ذرائع روزگار کا فقدان اوپر سے بیماریاں اور اب ایک ہی گھر کے دو افراد کا انتقال نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

۔ان صدموں اور کیمپوں کی مایوس کن صورت حال کے پیش نظر کیمپوں کے مکینوں کو اپنے آبائی علاقوں کی یاد ستانے لگی لہذا حالات پر امن ہونے اور سرحدوں کی صورت حال بہتر ہونے پر ان سب مکینوں میں سے کچھ نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھا۔وہ قافلہ جو 14 اگست 1947ء کے ہنگاموں میں پاکستان پہنچا تھا اب کسی حد تک حالات کے بہتر ہونے پر واپس اپنے آبائی وطن جا رہا تھا ان واپس جانے والوں میں یہ اور ان کا خاندان بھی تھا۔

کئی ہفتوں کی مسافت کے بعد باقی ماندہ کنبے کے ساتھ گھر پہنچے، کچھ وقت گھر میں قیام کیا۔والد اور بھائی کے انتقال کا غم کچھ کم ہوا تو فکر معاش کا غم ستانے لگا۔گھر میں کمانے والا کوئی اور فرد نہیں تھا دوسرے ہجرت کے پے در پے سفر اور صعوبتوں اور افراتفری کے حالات کے باعث فصلیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں رہی سہی کسر جنگ اور فسادات نے پوری کر دی تھی۔ان حالات میں روزگار کی ساری ذمہ داری چونکہ اب ان کے کاندھوں پر تھی لہذ گھر رہ کر خود کو کوسنے کی بجائے قسمت آزمائی کے لیے واپس پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور واہ کینٹ کو واپس اپنا مسکن بنایا۔یہ علاقہ چونکہ ان کا دیکھا بھالا تھا اور زندگی کے چند سال یہاں گزرے تھے اس لیے امید کامل تھی کہ کوئی نہ کوئی روزگار مل ہی جائے گا۔چنانچہ چند چھوٹی موٹی ملازمتوں کے بعد خوش قسمتی سے باقاعدہ پاکستان آرڈیننس فیکٹری POF واہ میں ملازمت کا آغاز کیا۔

ابھی ملازمت کرتے ہوئے چند سال ہی گزرے تھے کہ افتادطبع آڑے آئی۔اس بار گھر تبدیل کرنے کی بجائے ملازمت تبدیل کرنے کا ارادہ کیا اور 1960 میں پاکستان آرڈیننس فیکٹری سے پاکستان آرمی کی آرمڈ کور 25 کیولری کے ہو رہے۔چنانچہ ٹرینگ کے مراحل سے گزر کر ٹینک آپریٹر کے طور پر پیشہ ورانہ شروعات کیں اور مختلف شہروں میں عسکری خدمات سرانجام دیتے رہے۔1965ء کی پاک بھارت جنگ کا آغاز ہوا تو سیالکوٹ کے قریب چونڈہ کے محاذ کا دفاع ان کی یونٹ کو سونپا گیا۔

دوسری جنگ عظیم میں کرسک کے محاذ پر ٹینکوں کی سب سے بڑی جنگ کے بعد دنیا کی سب سے بڑی ٹینکوں کی یہ جنگ اسی محاذ پر لڑی گئی۔17 روزہ اس جنگ میں جہاں عساکر پاکستان کی جراتوں اور شجاعتوں کی ہزاروں کہانیاں اس دھرتی کے طول وعرض پر رقم ہوئیں وہیں آرمڈ کور کے جوانوں اور آفیسران کی

جرات و بہادری کی کئی داستانیں بھی چونڈہ کے محاذ پر رقم ہوئیں۔

ہمارے گھر میں اکثر کسی نہ کسی حوالے سے بات چیت ہوتے ہوئے موضوع سخن پاک بھارت جنگ پر چلا جاتا اور ابا جی بڑے فخر سے اپنے اور اپنی یونٹ کے مین آف سٹیل کہلانے کے اعزاز کا ذکر کرتے۔ جب بھی وہ بیتے دنوں کی داستانیں سنانے لگتے تو ایک عجیب سی چمک ان کی آنکھوں میں آجاتی، آنکھیں ڈبڈبا جاتی۔ فخر یہ انداز میں پاک فوج کی جراتوں وشجاعتوں کی داستانوں پر جی بھر کر داد دی جاتی۔ اپنے مین آف سٹیل کہلانے کے تذکرے کو بڑے فخر سے بیان کرتے۔ وہ سنایا کرتے کہ 1965 کی جنگ میں جب انڈیا نے اپنے ٹینکوں کا پورا ڈویژن جنگ میں جھونک دیا اور چونڈہ کے راستے سے پاکستان میں داخل ہونے کی کوشش کی تو ہمارے پاس اس کے دفاع کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ آگ و آہن کا مقابلہ کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اس بات کی اطلاع جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو دی گئی تو اُنھوں نے وہ تاریخی تقریر کی جس نے جوانوں کے دل گرما دیے۔ ایوب خان نے تو زبانی خود کو جنگ کے لیے پیش کیا مگر ہماری یونٹ کے جوانوں نے عملاً اپنے جسموں کے ساتھ بم باندھ کر ٹینکوں کی یلغار کے آگے لیٹ کر ان کو تباہ کیا اور ان کے حملے کو ناکام بنایا۔

اسی معرکے میں انڈیا کا وہ تاریخی ٹینک صحیح سلامت ہماری سپاہ کے ہاتھ لگا جس میں جنگ کی تمام تفصیلات درج تھیں اور جنگ کے تمام نقشے موجود تھے۔ یہی وہ ٹینک تھا جس کی بعد میں مختلف مقامات پر نمائش کی گئی اور آج بھی بطور یادگار کھاریاں کینٹ میں موجود ہے۔ 1965ء کی جنگ تو ختم ہوگئی حالات بدلتے رہے سیاسی حکومتیں تبدیل ہوتی رہیں۔ پاک بھارت کئی جنگیں اور جھڑپیں اس کے بعد بھی ہوتی رہیں اور اب بھی ہو رہی ہیں مگر اس سارے عرصہ میں اگر کچھ نہیں بدلا تو وہ تھا مین آف سٹیل جو جیسا پہلے دن تھا ویسا ہی اب بھی ہے۔ گویا پاک بھارت جنگ میں یونٹ اور ان کو عطا کیا جانے والا مین آف سٹیل کا سرٹیفکیٹ اور میڈل ان کے دل و دماغ پر اسی طرح کندہ کر دیا گیا جس کے نقوش گردش دوراں کبھی نہیں مٹا پائی۔

1965 اور 1971 کی پاک بھارت جنگیں ان کے جذبوں اور حوصلوں کی شاہد ہیں۔ خاص طور پر 1965 کی جنگ کے وہ لمحات جو انہوں نے اور ان کی یونٹ کے جوانوں نے آتش و آہن کی بارش میں

گزارے۔ مشکل ترین حالات میں جس صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی قسمت نے یاوری کی اس لیے دو جنگوں میں غازی بن کر لوٹے۔ 1975 میں پندرہ سالہ ملازمت کے بعد ریٹائرمنٹ کا فیصلہ کیا۔ یونٹ کی طرف سے ان کو ترقیابی اور ملازمت جاری رکھنے کی کئی طرح کی پیشکش ہوئی مگر آپ نے اسے قبول نہیں کیا۔

آپ نے اگرچہ فوج سے ظاہراً ریٹائرمنٹ لے لی مگر فوج ان کے دل و دماغ سے کبھی نہیں نکل سکی۔ اس لیے ہر سال قومی دنوں کی مناسبت سے سرکاری تقریبات میں شریک ہونا، مارچ پاسٹ کے مظاہرے دیکھنا، دفاعی نمائشوں میں حاضر ہونا ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ عساکر وطن سے ان کی یہ محبت ہمیشہ مثالی رہی۔ جس کا عملی ثبوت ان کی باقاعدہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی GHQ کے ساتھ بطور سول فرد ملازمت لمبے عرصہ تک جاری رہی۔

1989ء سے 1995ء تک ان کا رزق ان کو دیار حبیب پاک تک لے گیا اور ابتداً سعودی عرب کے سرحدی شہر حفرالباطن میں زیادہ عرصہ قیام رہا۔ خلیج کی پہلی جنگ میں سعودی عرب کا شہر حفرالباطن امریکی فوج کی سرگرمیوں کا مرکز تھا جہاں سے وہ کویت تک کمک پہنچا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عراق کے اتحادی افواج پر سب سے زیادہ حملے بھی حفرالباطن پر رہے۔ مین آف سٹیل یہاں بھی سارا عرصہ قائم و دائم رہے بجائے پیچھے ہٹنے اور اپنا دفاع کے جنگ کے ہر منظر کا حصہ بنے۔

سماجی زندگی کا ان کو کوئی خاص تجربہ نہیں تھا اس لیے ان کا اس حوالے سے حلقہ احباب بھی بہت مخصوص رہا البتہ ان مخصوص حلقوں سے وابستگی میں ہمیشہ باقاعدگی رہی۔ ان کی زندگی کا نظم ان کے کھانے پینے، ان کے سونے جاگنے اور ان کی نشست و برخاست سے لے کر ان کی عبادت تک ہمیشہ مثالی رہا۔ رات جلد سونا اور صبح جلد بیدار ہونا ان کی عمر بھر عادت رہی اور ہنوز جاری ہے۔ سحر خیزی کے دوران جس حد تک ممکن ہوتا یکسوئی اختیار کرتے۔ میرا یہ مشاہدہ رہا ہے کہ ہمارے بزرگوں میں کم علمی کے باوجود عمل کی پختگی میں کبھی کمی نہیں آئی اور جو بات ان کی سمجھ میں آجاتی وہ اس پر ہر طرح سے عمل پیرا رہتے ہیں۔ عمل کی یہ پختگی مجھے ان میں بھی ہمیشہ نظر آئی۔

ہر باپ کی طرح ان کو بھی اپنی اولاد سے محبت ہے مگر اس کا کھل کر اظہار بہت کم کرتے ۔فوجی نظم و ضبط یہاں بھی پورے جاہ وجلال سے عمر بھر نافذ رہا۔ان کا ماننا تھا کہ ایک فوجی کی زندگی اس کی قوم کی امانت ہوتی ہے جو کسی بھی وقت قوم کو لوٹائی جاسکتی ہے لہذا اولاد کی محبت اور اولاد سے محبت کو ہمیشہ سطحی رکھا جائے جہاں وہ زندہ رہ سکیں، سیلف میڈ بن کر زندگی گزار سکیں ۔ ورنہ محبت انسان کو اندر سے کمزور کر دیتی ہے اور انسان مرنے کی بجائے جینے کو ترجیح دیتا ہے۔شاید یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ساری زندگی گھر سے باہر اور دور رہ کر گزاری اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی اولاد ہمیشہ اپنی بقا کے لیے مصروف عمل رہی اور یوں ہر طرح کی بے راہ روی سے بچی رہی۔

باقی بچوں کے برعکس میرے ساتھ ان کی محبت ہمیشہ ہی مختلف رہی۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ انھوں نے کبھی مجھے نام لے کر مخاطب کیا ہو۔وہ ہمیشہ مجھے دلشاد صاحب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ جب بھی جہاں سے بھی لوٹ کر ان کے پاس آؤں بسم اللہ، بسم اللہ کہہ کر مخاطب کرنا، گلے لگانا، حال پوچھنا، پھر پورے دن کی خبروں یا اخبار میں چھپنے والی خبروں کا احوال بیان کرنا، خود ان پر تبصرہ کرنا، مجھ سے ان پر رائے لینا ایک ایسا معمول ہے جو اس وقت بھی جاری تھا جب وہ صحت کی بہترین حالت میں ہوا کرتے تھے اور آج بھی جاری ہے جب وہ صاحب فراش ہیں اور فالج کی وجہ سے گزشتہ سات سال سے دایاں بازو اور ٹانگ کے علاوہ اپنا جسم ہلانے سے قاصر ہیں۔

میں جب بھی گھر سے باہر جانے کے لیے ان کے پاس اجازت لینے کے لیے جاؤں تو ہمیشہ بہت سی دعاؤں کے ساتھ ان کا مجھے رخصت کرنا میری زندگی کا وہ سرمایہ ہے جس کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی۔ سرکاری امور کی انجام دہی کے لیے کسی دوسرے شہر جانا ہو یا کسی ضرورت سے کہیں دور پار سے بہت تاخیر سے واپسی ہو ۔کیسے ہی حالات میں گاڑی چلانا پڑ رہی ہو مجھے یقین ہوتا ہے کہ کبھی کوئی آزمائش میرے قریب نہیں آسکتی۔ یہ یقیناً دعاؤں کا وہ حصار ہے جو مجھے ہر آن اپنی حفاظت میں رکھتا ہے اور یہ وہ عظیم دولت ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہوسکتا۔

میں نے زندگی میں تین بار ان کو بستر سے لگتے دیکھا ہے۔ایک آٹھ اکتوبر 2005ء کے زلزلے

میں جب گھر کی دیوار کی زد میں آکران کی دونوں ٹانگیں پنڈلیوں سے ٹوٹ گئیں اورہمیں بذریعہ ہیلی کاپٹرسی ایم ایچ کھاریاں لے جایا گیا جہاں وہ دوماہ تک زیرِعلاج رہے۔دوسری بار2009ء میں ٹیکسلا میں ایک کوسٹر کی زد میں آکران کی بائیں ٹانگ ران سے کوسٹر تلے کچلنے کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوئی اورایک سال تک انہیں بستر سے لگنا پڑا۔تیسری بار اکتوبر2018ء میں فالج کا مہلک حملہ جس نے ان کے بائیں حصے کومکمل مفلوج کر کے رکھ دیا جو آج تک باوجودعلاج اورکوشش کے دوبارہ بحال نہیں ہو سکا۔

سی ایم ایچ کھاریاں میں علاج کا معاملہ بڑا عجیب تھا۔جب باغ سے بذریعہ ہیلی کاپٹر دیگرزخمیوں کے ساتھ ہمیں راولپنڈی لے جایا گیااوروہاں کے ہسپتالوں میں مزیدزخمیوں کی جگہ نہ ہونے کی بنا پر ہیلی کاپٹر کھاریاں کی طرف موڑ دیا گیااورابا جی کوسی ایم ایچ میں داخل کرلیا گیا۔اگلے دن آرمڈکور کےایک یونٹ کمانڈر زخمیوں کی تیمارداری کرنے ہسپتال آئے۔جب انہیں یہ خبر ہوئی کہ ابا جی کاتعلق بھی آرمڈکور سے رہا ہےتو وہ منظر بڑا دیدنی تھا۔باوجودزخمی ہونے اورتکلیف میں ہونے کے جس طرح وہ کرنل سے مخاطب تھےاورجس طرح وہ کرنل ان سےعزت سے پیش آرہا تھالفظوں میں بیان نہیں ہوسکتا۔کرنل صاحب بہت دیرتک ان کے بیڈ کے پاس موجودرہےان کی حوصلہ افزائی کی۔اس کے بعد مستقل طورپرایک فوجی جوان ان کی خدمت کے لیے مامورکیا گیااورمجھےسرکاری مہمان قرار دیتے ہوئےان کےہسپتال سےڈسچارج ہونے تک یونٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔

دوماہ ہسپتال میں گزارنے کے بعد جب انہیں ڈسچارج کیا گیاتو پہلے انہیں باقاعدہ یونٹ میں لے جایا گیا۔ان کی عزت افزائی کے لیےفوجی دربار لگایا گیا اور یونٹ کے جوانوں کے ساتھ ابا جی کا تعارف 1965ءاور1971ءکی جنگوں کے غازی کےطورپرکرایا گیا۔ان کی جنگی خدمات کےاعتراف اورکورکانام روشن کرنے پرمنعقدہ اس تقریب میں بھرپوراعتراف اور باقاعدہ حرف خراج پیش کر کے یونٹ سے رخصت کیا گیا۔بقول ابا جی یہ دن ان کی زندگی کا سب سے یادگار دن تھا۔1965ء کی جنگ میں شمولیت کے بعد مین آف سٹیل کےاعزاز سے لے کر2005ءمیں دوبارہ سرکاری سطح پران کے مین آف سٹیل ہونے کے اعزازکوحرف خراج ملناان کے لیےکسی نعمت عظمیٰ سےکم نہیں تھا۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو ظاہری طور پر اپنے آپ کو بہت مضبوط سمجھتے تھے مگر جب ان کو ناگہانی حالات اور خرابی صحت کا سامنا کرنا پڑا تو ان کی ساری مضبوطی اور قوت ارادی ریت کی دیوار ثابت ہوئی۔ اس کے برعکس جب میں اباجی کو دیکھتا ہوں تو ان پر جس طرح کے بھی حالات آئے۔ مشکل سے مشکل مراحل سے گزرنا پڑا، بدن زخموں سے اس قدر چور رہا کہ دیکھنے والے غش کھا کر گر پڑتے تھے مگر کیا مجال کہ درد کی شدت ان کے چہرے سے عیاں ہو اور غم کے احساسات کو نمایاں ہونے دیا ہو۔ جب بھی کسی نے آ کر حال احوال دریافت کیا ہو گا تو یہی کہا کرتے کہ اللہ کا شکر ہے اس سے بڑھ کر کوئی گلہ یا شکوہ زبان پر کبھی نہیں لایا۔ اس سے بڑھ کر کوئی شخص کیسے اور کتنا مین آف سٹیل ہو سکتا ہے جو درد و غم تو سہہ لیتا ہے مگر زبان سے شکوہ کناں نہیں۔

گزشتہ سات سال سے جس طرح کے حالات کا ان کو سامنا ہے وہ مضبوط سے مضبوط انسان کو بھی کمزور کرنے کے لیے کافی ہیں مگر جب ان سے بات ہوتی ہے تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ چند دن کی بات ہے ایک بار ٹھیک ہو جاؤں تو پھر یہ کروں گا، وہ کروں گا، پنڈی جاؤں گا، لاہور جاؤں گا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ آئے روز خبروں میں جس طرح کے ملکی حالات بتا رہے ان کو دیکھ کر اب یہی لگتا ہے کہ باعزت اس ملک سے کوچ کر جانا چاہیے۔ آپ ایسا کرو مجھے پاسپورٹ آفس لے چلو پاسپورٹ بنواتے ہیں اور سعودی عرب یا انگلینڈ میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے میں ان شاءاللہ اگلے چند دن میں مکمل ٹھیک ہو جاؤں گا۔

میں جب ان سے بات کر رہا ہوتا ہوں اور ان کے عزم کو دیکھ رہا ہوتا ہوں تو انگریزی ناول The old man and the sea کا خیال بار بار ذہن میں آتا ہے جس کے ہیرو کے متعلق ناول نگار نے بہت خوبصورت جملہ کہا ہے کہ Man can be destroyed but can not be defeated ...... بلاشبہ انسان اپنے اندر سے ہارتا ہے، فتح و شکست کے تمام معیارات کا فیصلہ انسان کی مضبوط قوت ارادی سے ہوتا ہے۔ انسان اگر خود کو مین آف سٹیل قرار دے کر اس پر عمل پیرا بھی ہو جائے تو دنیا کی بڑے سے بڑی طاقت بھی اسے شکست سے دوچار نہیں کر سکتی اس کے برعکس اگر وہ اندر سے ہار جائے تو اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔۔

عمر کی 87 بہاریں دیکھنے کے بعد آج بھی جب میں ان کے ولولے وعزم اور ہمت واستقامت کو دیکھتا ہوں ۔ان کی مضبوط قوت ارادی کا سوچ کر ان کے جسمانی خدوخال پر نظر ڈالتا ہوں ،ان کے ہاتھ کی مضبوط گرفت کو دیکھتا ہوں تو یہ بات دل سے ماننا پڑتی ہے کہ اگر ان سے اس بیماری کو الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ آج بھی ہمارے عہد کے مضبوط سے مضبوط جوان کے مقابلے میں قوی ہیں ۔مضبوط دل کے مالک ہیں ، زبردست قوت ارادی کے حامل ہیں ، پرانی یاداشت کمال کی ہے ، اُردو ، پنجابی اور سرائیکی کے سینکڑوں اشعار انہیں ازبر ہیں ۔بس شعر سنانے کے لیے انہیں میرا انتظار ہوتا ہے جیسے ہی ان کے پاس بیٹھوں گا چند باتوں کے بعد اشعار کی روانی شروع............

اے مدہم دردِ زخمِ جگر مرہم جو نہیں نشتر ہی سہی

ہم اس کو بھی اپنا کہتے ہیں جو وقت پہ کام آ جاتا ہے

اکرام الحق نے اپنی کتاب ''حیات سلیم'' میں اپنے والد کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ ''وہ زندگی کی حراست میں کبھی نہیں رہے بلکہ زندگی کو ہمیشہ اپنی مضبوط گرفت میں رکھا اور مرنے سے پہلے وہ جی بھر کر جئے ۔'' یہ بات سلیم خان کے بعد اگر کسی پر صادق آتی ہے تو وہ بلاشبہ مین آف سٹیل پر آتی ہے کہ انھوں نے خود کو کبھی زندگی کی حراست میں نہیں رکھا ۔ بلکہ زندگی پر ہمیشہ مضبوط گرفت رکھی ۔ مایوسی کو کبھی پاس بھٹکنے نہیں دیا ، لین دین میں خود کو سو فیصد کی سطح پر رکھا اگر کسی کا ایک روپیہ بھی تھا تو اسے بروقت ادا کیا ۔پچھلے چند دن سے ان کا اصرار ہے کہ مجھے میر پور لے چلو میں نے وہاں ایک سابق فوجی دوست کے تین ہزار روپے ادا کرنا ہیں ۔ہم پہلے بھی ایک بار میر پور گئے مگر اس کی علاقے کی شناخت اب ان سے ممکن نہیں سو یہ پریشانی لاحق ہے ۔

لگ بھگ نصف صدی پر مشتمل ازدواجی سفر میں اگر چہ انداز مین آف سٹیل کا ہی رہا اور اپنی شریک سفر پر ظاہراً غالب رہے مگر اس کے برعکس عملاً جب بھی کہیں کوئی بات ہوئی تو انتہائی عجز سے خود کو خادم اور اپنی بیوی کے بچوں کا نوکر کہا ۔جب جب گھر رہے ہمیشہ ہر ایک کام میں ہاتھ بٹانا ان کی سالوں پر مشتمل عادت رہی ہے ۔اب حال یہ ہے کہ قویٰ مضمحل ہو رہے ہیں ۔ایک ہی بستر پر مسلسل سات سال سے اور تقریباً ایک ہی حالت میں لیٹ لیٹ کر جسم نازک سے نازک تر کے سفر کی جانب تیزی سے گامزن ہے ۔ بیڈسول سے تو

اگرچہ آج تک عملاً بچے رہے ہیں مگر پھر بھی کب تک انسانی جسم ایک حالت میں خود کو بچا سکتا ہے۔ان کا کھانا، ان کا غسل،ان کی صحت وصفائی کا ہر مرحلہ عملاً بستر پر ہی سرانجام پاتا ہے۔اس کے باوجود ان کی سوچ ان کے جذبے میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہے۔

وہ موت سے خوف زدہ نہیں ،انھیں بیماری کی کوئی پرواہ نہیں ،انہیں زندگی سے کسی طرح کی کوئی مایوسی نہیں ۔انھیں ایک پل کے لیے بھی موت کا انتظار نہیں ،وہ ہر لمحے میں جی رہے ہیں اور ہر لمحے میں جینا چاہتے ہیں اپنے آپ کے ساتھ،اپنی ہمسفر کے ساتھ،اپنی اولاد کے ساتھ،اپنی اولاد کی اولاد کے ساتھ۔یہی وہ ہستیاں ہیں جن سے گھر کی رونق ہے، یہی وہ ہستیاں ہیں جو دعاؤں کے خزینے ہیں۔جو اپنے عہد کے امین بھی ہیں اور آنے والے دور کے نقیب بھی۔ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے دنیا کے اس بدلتے ہوئے منظر نامے کی تین نسلوں کو دیکھا۔مشقتوں والے عہد سے بھی گزرے،سہولیات کے عہد میں بھی زندگی گزاری اور اب عہد نو کی چکا چوند آنکھوں کو خیرہ کرنے والی جدتوں سے بھی اکتساب کرتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔

آج معاشرتی سطح پر ہم قحط الرجال کا شکار ہیں اور یہ قحط الرجال کسی ایک سطح پر نہیں زندگی کے ہر ایک شعبہ میں ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اور نمایاں ہوتا جارہا ہے۔یہ ہستیاں اس استحصال زدہ معاشرے میں کسی نعمت سے کم نہیں۔ان کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو زمانہ شناس بھی تھے اور زمانہ ساز بھی۔ان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ 1965 اور 1971 کی پاک بھارت جنگوں کے غازی رہے۔اپنی ساری زندگی وطن کی محبت اس کی آن بان اور شان کے لیے کوشاں رہے اور اب بھی اسی جذبے کے ساتھ گزار رہے ہیں۔

☆☆☆

بگاہ کا پیر

افلاطون سقراط کے حوالے سے جنون کی چار قسمیں بیان کرتا ہے، پیغمبری، القاء، شاعری اور عشق۔ مجھے ان میں سے چوتھی قسم عشق وہ بھی پروفیسر ڈاکٹر عبدالحسن عاصم کا اپنے وطن، اپنی مٹی اور اپنے افکار سے عشق پر بات کرنی ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے غربت اور تنگ دستی کے حالات میں اپنی زندگی کی شروعات کیں۔ حصول تعلیم کے لیے در در کی خاک چھانی اور تعلیم کی تکمیل کا مرحلہ ڈاکٹریٹ کی صورت میں وہ بھی فلسفہ میں انگلستان سے مکمل کیا۔ اس کے لیے تو اس کی پہلی اور آخری محبت صرف اور صرف انگلینڈ ہی ہونا چاہیے تھا۔ جس میں جانے اور جہاں رہنے اور مستقبل سنوارنے کا خواب آج بھی ہم میں سے ہر ایک دیکھتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے اس عشق کا جو اس آسودہ اور راحت انگیز ماحول میں بھی سکون لینے نہیں دیتا اور ایک آدمی جو مشکل ترین حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچا اور وہ سب کچھ پا بھی لیا جس کی ہم میں سے ہر کوئی تمنا کرتا ہے۔ مگر پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انگلینڈ کے برعکس باغ کو اور وہ بھی باغ شہر سے دور مضافات میں شیفلڈ کالج کی صورت جنگل میں منگل کرنے پہنچ جاتے ہیں۔

ساڑھے پانچ فٹ قد سانولا رنگ سر پر گھنے پیچھے کی طرف پھیرے ہوئے بڑے بال اور لمبی سی گھنی ڈاڑھی بھرا ہوا جسم، عموماً پینٹ شرٹ یا سوٹ میں ملبوس دیکھنے میں سرسید احمد خان کی وضع قطع مگر سرسید کے سر کے برعکس سر پر گھنے گھنگریالے بال جو کنگھی کی ہوئی حالت میں یوں دکھائی دیں گویا انہیں ابھی کنگھی کی حاجت ہے۔ اُردو، انگریزی اور پہاڑی پر یکساں عبور رکھنے والی ایک ایسی شخصیت جسے دور سے آتا ہوا دیکھ کر ہی کسی فلسفی کا گمان ہونے لگتا تھا۔ اس حلیے کے ساتھ وہ اہل باغ میں دور سے ہی الگ تھلگ پہچانے جاتے۔ اُردو

اورانگریزی کی بجائے پہاڑی کے اپنے مقامی لہجے میں گفتگو کرتے تو دل موہ لیتے۔کالج کی تعمیر و تکمیل اور مکمل فعال ہونے کے بعد ان کا اوڑھنا بچھونا صرف اور صرف شیفلڈ کالج تھا جہاں اُن کا رہن بسیرا بھی تھا اور جس کی تدریسی ذمہ داری کی نگرانی اور دیکھ بھال بھی وہ خود کرتے تھے۔

کالج کے اوقات کار میں مکمل تندہی کے ساتھ کالج کو وقت دیتے، تدریسی سٹاف کی نگرانی کرتے ان کی تربیت کرتے،طلبہ سے ذاتی تعلق کی بنا پر ان کی ایک ایک سرگرمی کی خبر رکھتے۔بورڈر طلبہ کی دیکھ بھال چھٹی ٹائم کے بعد بھی کرتے۔طلبہ کے اندر تربیتی شعور اجاگر کرنے کے لیے مختلف مطالعاتی اور تربیتی دوروں کا اہتمام کرتے۔ان کے لیے مختلف سیاحتی اور تاریخی مقامات پر کیمپنگ کا اہتمام کرتے۔ یہ کیمپنگ بعض اوقات دو دو ہفتوں تک کی بھی ہوتی۔جس میں طلبہ اس بات کے پابند ہوتے کہ وہ کیمپ قائم کرنے سے لے کر اس میں کھانے پینے، رہنے، حفاظت اور دیگر تمام امور خود سرانجام دیتے۔اس ساری کیمپنگ میں ڈاکٹر صاحب اپنے تدریسی سٹاف کے ساتھ خود بھی قیام کرتے اور طلبہ کو عملی تربیت کے مراحل سے گزارتے۔ ہمارے ہاں کے روایتی نظام تعلیم کے برعکس او لیول اور اے لیول کا انتظام اور اس کے لیے تمام تر کوششیں بروئے کار لا کر اس کو عملی طور پر ممکن بنانے کا سارا انتظام خود سرانجام دے کر ایک دو نہیں کئی تعلیمی بیج فارغ کیے۔

شیفلیڈ کالج کو صحیح معنوں میں باغ میں تعلیم و تربیت کے حوالے سے ایک بہترین ادارہ کی صورت دینا ان کا بلاشبہ زریں کارنامہ تھا جس کے لیے انھوں نے تمام ذرائع بروئے کار لائے۔ادارے کے لیے جگہ کے حصول کے مشکل ترین مرحلے سے لے کر اس کی عمارت کی تعمیر اور تکمیل اور پھر تدریسی عمل شروع کرنے تک کا سارا کام جس محنت، لگن اور تندھی سے انھوں نے سرانجام دیا وہ اگر ناممکن نہیں تو مشکل کام ضرور تھا جسے انھوں نے ایسی خوبصورتی سے سرانجام دیا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔

کالج کے اوقات کار کے بعد سے شام تک کے درمیان کا مختصر سا دورانیہ ان کے لیے وہ اوقاتِ فرصت ہوتا تھا جس میں وہ کالج سے باہر نکل کر شہر آتے اور دوست احباب کے ساتھ بیٹھتے۔رات کا زیادہ تر وقت مطالعہ میں گزارتے اور مطالعہ کے معاملہ میں وہ ہمیشہ بہت خود کفیل تھے۔ان کی لائبریری میں ہر ایک موضوع پر کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا جن میں سے زیادہ تر وہ کتابیں تھیں جو ان کی ذاتی ملکیت تھیں۔ہم میں سے

بہت سے لوگ اپنے طور پر کتابیں جمع کرنے کے بہت شوقین ہوتے ہیں مگر ساری زندگی میں شاید کوئی ایک کتاب پڑھنے کی بھی ان کو توفیق نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ان کی لائبریری میں جتنی بھی کتابیں تھیں وہ کسی نہ کسی صورت میں ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ اس مطالعہ کا اندازہ اور اظہار عموماً ہماری ان محافل میں ہوتا جب ہم شام میں ایک ساتھ بیٹھتے۔ اپنی عمر کے برعکس اپنے سے بڑے اور چھوٹے ہر ایک کے دوست ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے، یہ ڈاکٹر عبدالحسن عاصم کی پوری شخصیت تھی۔

ڈاکٹر صاحب سے ہماری رفاقت کا دورانیہ لگ بھگ پندرہ سالوں پر مشتمل رہا۔ اس سارے عرصہ میں ان کے بہت قریب رہنے، ان کے خیالات وافکار جاننے، ان کے جذبے اور لگن کو سمجھنے اور اُس جذبے اور لگن کے لیے خود کو فنا کرتے دیکھا۔ بلاشبہ وہ ایک ماہرِ تعلیم، ایک فلسفی، ایک تاریخ دان، ایک ماہر نفسیات، ایک محبِّ وطن، ایک سیاح تھے ہی مگر ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ جو اُن کو اس بڑے کام کے لیے وقف کرتے اور اس کے لیے تن من دھن صرف کرتے دیکھا وہ جذبہ تو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ اپنی ذات کا ہر ایک جوہر جو اگر انگلینڈ جیسی سرزمین پر رہتے تو کبھی نہ کھلتا جو شیفلڈ کالج کے خیال سے پیکر میں ڈھلنے تک کے سارے دورانیے میں ان میں کھلتا دیکھا۔ آج میرے اور آپ کے سامنے شیفلڈ کالج محض ایک عمارت ہی نہیں بلکہ جذبہ، لگن اور قربانی کی انتھک اور لازوال داستان ہے جس میں ہزاروں تشنگانِ علم اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق جِلا پا رہے ہیں۔

سیر وسیاحت کا بہت شوق تھا اور ان کا یہ شوق ان کو کئی ممالک کی یاترا پر لے گیا۔ ہماری محافل میں اکثر جب اس طرح کے کسی موضوع پر بات شروع ہوتی تو ان کی سیاحت کے دلچسپ واقعات محفل کو کشت زعفران بنا دیتے۔ ہمیں کہا کرتے کہ اگر اللہ نے موقع دیا تو میں آپ کو کشمیر اور ہندوستان کی سیاحت پر ضرور ساتھ لے کر جاؤں گا۔ دہلی، آگرہ اور کشمیر کی یاترا کی بات اتنی دلچسپی سے اور اس طرح ڈوب کر کرتے کہ کچھ دیر کے لیے گمان ہوتا کہ وہ ابھی وہاں موجود ہیں اور سامنے کا ایک ایک منظر جزیات کے ساتھ ہمیں سنا رہے ہیں۔

اریب صاحب جب آپ دہلی جائیں گے تو پورا دہلی ایک دن میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہاں سیاحوں

کے لیے اس طرح بسوں اور گائیڈز کا اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ ہر تاریخی اور تفریحی مقام پر آنے والوں کو لے کر جاتی ہیں اور ان مقامات کی سیر حاصل سیر اور معلومات سے آپ کا دامن بھر دیتے ہیں۔ لال قلعہ دہلی، جامع مسجد دہلی، دہلی کا سب سے بڑا عجائب گھر اور اس میں رکھا گیا ایک ایک نوادرات کا نمونہ آپ کی توجہ کھینچ لے گا بشرطیکہ آپ کو آرٹ، تاریخ اور فنون لطیفہ سے دلچسپی ہو۔ ان نوادرات میں سے ان کی مذہبی علامات، انسانی جنسی اعضا اور وہ سب چیزیں جنھیں بڑے سلیقے سے تراش کر اس طرح سجایا گیا ہے جو آنے والوں کے قدم روک لیتی ہیں۔

تاج محل آگرہ اگر دیکھنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ تب وہاں جائیں جب چاند اپنے پورے جوبن پر ہو۔ دن کے وقت تاج محل کی دلفریبی اپنی جگہ ہے مگر جو دلفریبی تاج محل چودھویں رات میں دیتا ہے اس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ سفید سنگ مرمر سے تراشا تاج محل جہاں اس کے بنانے والوں کے فن تعمیر کا عکاس ہے، اس کے خدوخال تراش کر ایک ایسی عمارت کی شکل میں ڈھالنے والوں کے ذوق سلیم کا شاہکار ہے وہیں صاف شفاف چودھویں رات میں سفید سنگ مرمر کے ساتھ ان ساری چیزوں کے ملاپ سے جو رومانوی کیفیات تشکیل پاتی ہیں اہل محبت انھیں دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے دنیا بھر سے آگرہ آتے ہیں ۔ چودھویں رات کا انتظار کرتے ہیں اور پھر چاندنی میں اس کی دلفریبیوں میں کھو جاتے ہیں۔ بلاشبہ تاج محل شاہجہان کا وہ تاریخی اور رومانوی شاہکار ہے جو ایک طرف اس کی ممتاز محل کے ساتھ محبت کا گواہ ہے تو دوسری طرف اس کے ذوق سلیم کا عینی شاہد۔ جہاں آپ کو چاندنی میں تاج محل کے آس پاس پریاں اترتی محسوس ہوتی ہیں۔

اور ہاں جب آپ کشمیر جائیں گے تو کشمیر کے بارے میں کسی شاعر نے یوں ہی نہیں کہا تھا کہ

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

کشمیر کی خوبصورتی اور دل فریبیاں وہ آفاقی سچائیاں ہیں جن کا ہم یہاں رہ کر اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس تو جو خطہ ہے اور جسے ہم کشمیر کہتے ہیں یہ تو کشمیر ہے ہی نہیں یہ تو زیادہ تر صوبہ جموں کا وہ حصہ ہے جو

1947ء میں آزاد ہوا۔ اصل وادی کشمیر تو گنگا چوٹی سے پرے شروع ہوتی ہے جو مظفر آباد اور نیلم و جہلم سے ہوتی ہوئی سری نگر اور اس کے مضافات تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔ آپ لوگ جس معاہدہ امرتسر کی بات کرتے ہیں جس کے تحت کشمیر پچھتر لاکھ نانک شاہی کے عوض بکا وہ یہ کشمیر نہیں تھا جس میں ہم رہتے ہیں وہ وادی کشمیر تھا جو آج بھی بھارتی استعمار کے قبضے میں ہے۔ جھیل ڈل کا حسن، گلمرگ، سونا مرگ، اننت ناگ، بارہ مولہ، سری نگر قدرت کے وہ شاہکار ہیں جن کی مثال دنیا بھر میں کہیں نہیں ۔ میں نے دنیا کے بہت سے ممالک کی سیاحت کی ہے مگر جو قدرتی حسن قدرت نے کشمیر کو ودیعت کیا ہے وہ دنیا بھر میں کسی اور خطے اور کسی اور ملک کے حصے میں نہیں آیا۔

یہ اور اس طرح کے کتنے ہی ایسے واقعات ان کی زبان پر ہوتے جو سنتے سنتے سامعین کو دور ان وادیوں اور مرغزاروں میں لے جاتے جن سے ڈاکٹر عبدالحسن عاصم گزر کر آئے تھے۔ ان کا انداز بیان اتنا دل نشین ہوتا جو سننے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ ایک مرتبہ اپنی پراسٹیٹ کی تکلیف کا ذکر کرنے لگے کہ مجھے پراسٹیٹ کی بہت زیادہ تکلیف ہوگئی اور برطانیہ کے ڈاکٹروں نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ میں گزشتہ کئی ماہ کی لگا تار مصروفیات کے باعث صفائی، بالوں کی کٹنگ اور خط وغیرہ نہیں بنوا سکا۔ آپریشن سے پہلے مجھے آپریشن تھیٹر میں شفٹ کیا گیا۔ ایک نرس میرے پاس آئی اور اس نے جب میرے بڑھے ہوئے بالوں کو دیکھا تو چلائی مسٹر عاصم آر یو سکھ؟ میں بھلا اسے کیا کہتا۔ چپ چاپ آنکھیں بند کیے مکر کیے رہا، بالآخر انھوں نے ضروری انتظامات کیے اور بعد ازاں میرا آپریشن کیا۔ کتنی ہی ایسی مثالیں اور لطائف تھے جنھیں وہ لطف لے لے کر سناتے، خود پر بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔

کہتے ہیں جس طرح رزق کا دانا پانی ہوتا ہے اسی طرح علم کا بھی دانا پانی ہوتا ہے۔ جس کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے اور جس سے لکھا ہوتا ہے اس سے مل کر رہتا ہے۔ سواہل باغ کی یہ خوش قسمتی رہی کہ ڈاکٹر عبدالحسن عاصم کی صورت میں ان کو ایک ایسا بظاہر درویش منش مگر اپنی دھن کا پکا ماہر علم میسر آیا جو نہ صرف اپنی ساری جمع پونجی بلکہ چیرٹی کی صورت میں بہت کچھ سمندر پار سے قطرہ قطرہ جمع کر کے لاتا رہا۔ پہلے اسے ایک باقاعدہ ادارے کی شکل دی، اس کے لیے دن رات ایک کیا اور پھر اس کے پہرے پر بیٹھ کر زیور تعلیم سے نسل نو

کومنور کرنا شروع کیا۔

لیون ٹراٹسکی نے کہیں لکھا تھا ''مجھے حیرت ہے کہ کسی عظیم ترین مقصد کے بغیر لوگ زندگی کیسے گزار لیتے ہیں''۔ ہم میں سے اکثر کی عمریں خواہشات کا بوجھ ڈھونے، جینے کا سامان کرنے اور اس ساری تگ ودو میں شرف ومعیار انسانیت سے گرنے میں گزر جاتی ہیں۔ ہمیں کیا معلوم کہ زندگی کرنا کس بلا کا نام ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ہماری تو زندگی ہی ان چوپائیوں کی سی ہے جو پیٹ، نفس اور تولید کے دائرے سے باہر نہیں آتے۔ اگر یہی زندگی ہے تو موت کیا ہے اور اگر موت ہے تو کس کی آمد کا جشن اور کس کے جانے کا واویلا۔

ڈاکٹر صاحب اس معاملے میں بہت خوش قسمت تھے کہ اُنھوں نے اپنے جینے کے مقصد کا سب سے پہلے تعین کیا پھر اس کے بعد اپنی ساری توانائیاں اس مقصد کی تکمیل میں صرف کر دیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں ہم ہر ایک کو مادیت کے ترازو پر تولتے ہیں۔ جو اس ترازو پر پورا اتر جائے وہ ہمارا ہیرو ہوتا ہے اور ہم بلا سوچے سمجھے اس کی اقتدا کرنا شروع کر دیتے ہیں چاہے وہ معیار انسانیت کے ترازو پر کوئی بُونا ہی کیوں نہ ہو۔ ہم ادیب،، شاعر، اہل علم اسے کہتے ہیں جس کی درجنوں کتابیں ہوں جس کے اشعار، جس کے افکار چاہے ٹرکوں کے پیچھے ہی کیوں نہ لکھے ہوں۔ کسی حقیقی اہل علم، اہل ہنر پر ہماری نظر جا کر ٹھہرتی ہی نہیں۔

علامہ اقبال کو جب سر کا خطاب دیا جانے لگا تو انھوں نے شرط عائد کی کہ پہلے ان کے استاد مولوی میر حسن کو یہ اعزاز دیا جائے۔ جب ان سے کہا گیا کہ اس خطاب کے لیے ان کی کوئی تصنیف ہونی چاہیے تو علامہ اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ ان کی زندہ وجاوید تصنیف میں خود ہوں۔ سو ڈاکٹر عبدالحسن عاصم بھی ایسے ہی اہل علم وہنر تھے جن کی زندہ وجاوید تصنیف کہیں تو وہ خود تھے اور کہیں شیفلڈ کالج باغ اور اس میں پڑھنے اور اس سے فارغ التحصیل ہونے والے ہزاروں وہ طلبہ ہیں جو ہر سال طلبہ کی صورت میں شائع بھی ہوتے رہیں گے اور بار بار پڑھے بھی جاتے رہیں گے۔

ہمارا ڈاکٹر صاحب سے چھٹی کے بعد کا رشتہ تھا جو گھنٹوں پھیلی بے شمار نشستوں پر مشتمل تھا۔ ایک

ایسے ہمدرد، ملنسار، مخلص بھائی، دوست اور بزرگ کا رشتہ تھا جو دل میں اترتا ہی چلا جاتا تھا۔ دوستوں میں رہتے ہوئے کبھی انہیں ممتاز ہوتے نہیں دیکھا۔ محفل کو کشت زعفران بنانے کا ہنر انھیں خوب آتا تھا۔ اس ساری رفاقت میں ہمیں انھوں نے یہ محسوس کرنے ہی نہیں دیا کہ ان کی نسبت باغ کے علاوہ بھی کہیں ہو سکتی ہے۔ کشمیر اور کشمیریت سے رشتہ ان کی نس نس میں بھرا تھا۔ اس لیے جب بھی کسی موضوع پر کوئی بات شروع ہوتی تو گھوم پھر کر کشمیر پر ہی ٹوٹتی۔

سیر و سیاحت کا انہیں گویا نشہ سا تھا اس لیے وہ انگلستان رہتے ہوئے بھی اس نشہ کی تکمیل کرتے رہے اور جب ان کی اگلی منزل کشمیر اور وہ بھی باغ ٹھہری تب بھی وہ اپنے اس نشہ کو کسی نہ کسی صورت ضرور پورا کر لیتے۔ ہندوستان اور بالخصوص مقبوضہ کشمیر کے تقریباً تمام ہی مقامات کی سیاحت انگلینڈ سے ویزہ لے کر پوری کی جس کا جزیات کے ساتھ تذکرہ کرتے۔ اس طرح یورپ اور مشرقی ایشیاء کے دیگر ممالک کی سیاحت کا ذکر بھی بڑے شوق سے کرتے تھے۔ یہاں رہتے ہوئے اس شوق کی تکمیل کبھی تو مختلف پہاڑی اور سیاحتی مقامات کی اپنے بچوں کی دو دو ہفتوں کی کیمپنگ کر کے کرتے رہے تو کبھی دوستوں کے ساتھ مختلف علاقوں کی سیر کی صورت میں کر لیتے۔

بیماری سے کسی حد تک سنبھلے ہی تھے کہ دوستوں کے ساتھ وادی نیلم کی سیر کا پروگرام بنالیا۔ اب باقی تو اپنی جوانی اور صحت کے حوالے سے ہر طرح کی مشکلات سہ سکتے تھے جبکہ ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ سب جان جوکھوں کا کام تھا اس کے باوجود جب بھی دوران سفر ان سے پوچھتے کہ ڈاکٹر صاحب آپ کیسے ہیں تو ایک دم انگوٹھے کے نشان سے زور سے کہتے آئی ایم کوائٹ او کے۔ رتی گلی جھیل کا جیپوں کا سفر اس قدر مشکل اور تھکا دینے والا تھا اور آج بھی ہے اس کے باوجود جب رتی گلی پہنچے تو کیا مجال کے چہرے پر کسی نقاہت یا بے چینی کا احساس ہو یس ائی ایم او کے، آئی ایم آل رائٹ۔ یہ ان کا وہ جذبہ تھا جو ہمیشہ نا قابل شکست رہا۔

آخری چند سالوں میں بلند فشار خون اور خون میں بڑھتی ہوئی مٹھاس نے ان کے کام کی رفتار کو سست کر دیا۔ سال میں دو سے تین بار اگرچہ واپس انگلینڈ جانا ان کا باقاعدگی سے معمول تھا جہاں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ اپنی صحت کے حوالے سے بھی تشخیص اور ادویات کے ساتھ

با قاعدہ کرتے۔ واپس باغ آتے تو ان کی اہلیہ ادویات کے اوقات کار کے حساب سے ان کو باقاعدگی سے کال کر کے یاد دلاتی اور ادویات کے استعمال کو یقینی بناتی۔ رات کو باقاعدگی سے کال کر کے دن بھر کے ان کے معمولات سے آگاہی حاصل کرتی اور ادویات کے استعمال کو یقینی بناتی۔

سردار شعیب خان ہمارے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ شیفلڈ کالج باغ کی منظوری سے اس کے باقاعدہ آپریشنل ہونے تک قدم قدم پر ڈاکٹر صاحب کے ہم رکاب، ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ وہ ان کی صحت کے حوالے سے بھی ہمیشہ باخبر رہتے اور ہر ممکن طریقے سے ان کی دیکھ بھال کرتے۔ آخری عرصہ میں بڑھتی ہوئی ذیابیطس نے ان کو عملاً کام کاج اور چہل پہل سے روک دیا تھا۔ اسی حالت میں ایک روز اچانک صحت زیادہ خراب ہونے پر انہیں ہسپتال داخل ہونا پڑا۔ شدت مرض پر مجبوراً باغ سے برطانیہ منتقل ہونا پڑا۔ جہاں کئی ماہ وہ زیر علاج رہے مگر طبعیت تھی کہ ہرگزرتے دن کے ساتھ بگڑتی جا رہی تھی۔ اب کی بار جو بگڑی تو پھر تمام تر کوششوں اور جدید ترین طبی سہولتوں کے باوجود نہیں سنبھل پائی اور اس مرد بینا کو عالم فنا سے عالم بقا کی طرف لے کر چل دی۔

مولانا روم سے کسی نے ان کی زندگی کے آخری ایام میں پوچھا کہ آپ دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں تو انھوں نے فرمایا ''میں دنیا کی مسند سے اُتر کر لوگوں کے دلوں کی مسند پر بیٹھنے جا رہا ہوں'' کچھ ایسا ہی معاملہ ڈاکٹر عبدالحسن عاصم کا بھی رہا۔ وہ بظاہر بہت عام سے آدمی تھے مگر عام ہوتے ہوئے بھی بہت خاص تھے۔ اس 69 سالہ سفر حیات جس کا آغاز اُنھوں نے بگاہ تتہ پانی سے 11 نومبر 1952ء کو کیا تھا، 28 مئی 2021ء کو دنیا کی مسند سے اُتر کر میرے، آپ کے، اُن سے وابستہ اقرباء واحباب اور ہزاروں طلبہ کے دلوں کی مسند پر جلوہ افروز ہو گئے۔ وہ بہت خوش قسمت تھے جو اپنے پیچھے ایک ایسا صدقہ جاریہ کا اکاؤنٹ شیفلڈ کالج کی صورت میں چھوڑ کر گئے جس کا منافع ان کی روح تک تا ابد یوں ہی پہنچتا رہے گا۔

گہنا گیا وہ چاند مگر اس کے نور سے
دیوار و در وطن کے ہیں تاباں اسی طرح

☆☆☆

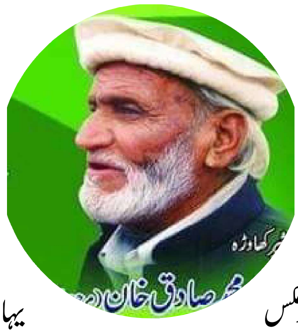

فخر کھاوڑا

ڈگری کالج ڈنہ میں میری تعیناتی کا دورانیہ لگ بھگ دس سال تک رہا۔ ظاہری اعتبار سے اس علاقے کی وجہ شہرت کے برعکس یہاں رہتے ہوئے بہت اچھے دوست احباب بنے اور یہ سارا عرصہ بحیثیت مجموعی بہت یادگار گزرا۔ ان دس سالوں میں یہاں رہتے ہوئے جو دوست احباب ملے ان میں ایک نام مفتی سکندر وسیم کا بھی ہے جو ڈگری کالج ڈنہ میں سیاسیات کی اسامی پر ایڈہاک تقرر کے بعد بطور لیکچرار حاضر ہوئے تھے۔ یہاں آنے سے قبل وہ کچھ عرصہ ایڈہاک تحصیل مفتی کی خدمات بھی سرانجام دے چکے تھے۔ اپنی ہی منش کے جی دار آدمی ہیں بہت یار باش، خوش لباس، خوش خوراک، خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے والے۔

ڈگری کالج ڈنہ میں تعینات دیگر غیر مقامی سٹاف کے برعکس خالصتاً مقامی اور قریب کے ایک گاؤں کلیان شریف کے باسی۔ رفتہ رفتہ ہماری پیشہ وارانہ رفاقت ذاتی تعلق اور دوستی سے ہوتے ہوتے ان کے گھر تک جا پہنچی۔ میرے اور ان کے درمیان قدر مشترک یک جہتی کے برعکس کثیر جہتی اور ہفت رنگ رہی ہے۔ ادب اور ادیب پرور شخص کی حیثیت سے ہماری ملاقاتیں ہی ملاقاتیں رہتیں، شام کی واک ہوتی، بحثیں چلتیں، نئی نئی کتابوں کے تبادلے ہوتے، مطالعہ کی گئی کتابوں پر گفتگو ہوتی۔ ان کو میری تحریر اور مجھے ان کی تقریر بہت پسند تھی، ہے اور رہے گی، خوش اخلاق اور ملنسار تو ہیں ہی لیکن مہمان نوازی کی صفت ایسی ہے جو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

ان کا گھرانہ بہت سی سیاسی اور سماجی روایات کا حامل رہا ہے اور یہ احوال رفتہ رفتہ مجھ پر منکشف ہوتے گئے۔ ان کے تایا اور سسر مولوی محمد صادق خان اس علاقے کی بہت بڑی سماجی شخصیت ہو گزرے تھے۔ ان سے قبل ان کے دادا مولانا متن متین کا شمار بھی اپنے وقت کی جید ہستیوں میں کیا جاتا تھا۔ وہ مولانا متن متین جو اگر کسی بڑے علمی مرکز کا حصہ بن کر زندگی گزارتے تو ان کی شہرت اور ان کے تلامذہ کی تعداد یقیناً لاکھوں میں

ہوتی۔ وہ متن متین جن کے بارے میں روایات ہیں کہ وہ جامعۃ الازہر سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تھے اور اپنے آبائی علاقے میں درس و تدریس سے وابستہ تھے۔

جن کی علمی شہرت کا حال یہ تھا کہ مولانا انور شاہ کشمیری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مولانا متن متین کو بلایا اور انہیں اپنے ساتھ دارالعلوم دیوبند چلنے کی دعوت دی تاکہ ان کے علم سے مخلوق خدا کو فیض مل سکے مگر مولانا متن متین نے ان کی ساری پیشکش کو سننے کے بعد بس اتنا کہا تھا کہ میں دیوبند جا کر وہاں کے تشنگان علم کو توفیض پہنچاؤں گا مگر میرے علاقے کے غریب لوگ اس سے محروم رہ جائیں گے لہذا میں انہی کے درمیان رہ کر ان کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور پھر وقت نے دیکھا کہ ملک کے طول و عرض سے تشنگان علم کلیان شریف ان کے پاس آتے رہے۔ یہ ایک ایسا علمی اور روحانی فیض تھا جو ان کی زندگی میں بھی جاری رہا اور ان کے بعد مولوی محمد صادق خان کی صورت میں اگلی نسل سے ہوتے ہوئے اب بھی اسی تسلسل سے جاری و ساری ہے۔

راولپنڈی سے بذریعہ کوہالہ مظفرآباد جاتے ہوئے چھتر کلاس کے مقام پر ایک سڑک دائیں طرف نکلتی ہے جو تاریخی اہمیت کے حامل علاقے ڈنہ کچیلی کی طرف جاتی ہے۔ بارہا یہاں سے گزرتے ہوئے ایک بڑا روڈ سائن بورڈ سردار مولوی محمد صادق خان روڈ گزرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہ یقیناً علاقہ کھاوڑا کی کسی ایسی شخصیت کو خراج عقیدت ہے جس نے ان کی زندگی کی سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر ایسی شاہراہ حیات میں تبدیل کیا جس پر اپنے بیگانے سہولت و سکون کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جب کسی سے کام لینے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایسے مصمم ارادے بھر دیتا ہے جن کے آگے صحرا و دریا، پہاڑ و وادیاں کوئی معنی نہیں رکھتی۔

مفتی سکندر وسیم کے چچا اور سسر سردار مولوی محمد صادق خان کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں ایک ایسے دور میں آپ کی پیدائش ہوئی جب ایک طرف کشمیر پر ڈوگرہ راج پوری طرح مسلط تھا وہیں دوسری طرف آزادی کے پروانے شمع آزادی پر نثار ہو رہے تھے۔ آپ کا بچپن اور لڑکپن انہی ہنگامہ خیز حالات میں گزرا۔ قیام پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء اور قیام آزاد کشمیر ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے بعد اگرچہ ڈوگرہ

راج اس خطے سے رخصت ہو گیا مگر سماجی ومعاشرتی سطح پر کوئی خاص انقلاب رونما نہیں ہو سکا۔

اس علاقے کے غریب پسماندہ، کمزور اور ضعیف اسی طرح کے جبر کا شکار تھے جو ڈوگرہ عہد میں رائج تھا۔ ان حالات میں کسی ایسے مصلح کی ضرورت تھی جو ان مظالم کا ادراک کرتے ہوئے نہ صرف اس پر آواز حق بلند کر سکے بلکہ ان مظالم کے آگے بند باندھ سکے۔ قدرت نے یہ کام سردار مولوی محمد صادق خان سے لیا۔ وہ مولوی صادق جو ایک وقت تک تلاش معاش اور اپنے کنبے کی کفالت میں ہمہ تن مشغول تھے سب کچھ ترک کر کے واپس اپنے علاقے میں آ کر سماجی خدمت میں پیش پیش ہو گئے۔

یہ ایک ایسا کام تھا جو آن واحد میں ناممکن تھا اس لئے کہ سماجی ڈھانچے کی جس تشکیل میں صدیاں صرف ہوتی ہوں انہیں تبدیل کرنے کے لیے بھی عمر خضر کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر آپ کے پائے استقلال میں کمی نہیں آئی اور آپ نے اس تبدیلی کے لئے اپنے دن رات ایک کیے، خود کو اس کام کے لیے وقف کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ سماجی سطح پر بیداری کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری جو وقت کی اولین ضرورت تھی کو بھی ممکن اور یقینی بنایا۔ ملی بیداری کی ان شبانہ روز کاوشوں میں اگرچہ وقت لگا مگر آخر کار ایک ایسا ماحول پیدا ہوا جس نے عوام الناس کو اپنے حقوق حاصل کرنے کا شعور دیا۔

آپ اگر چاہتے تو اپنی ذاتی زندگی بہت سہولت کے ساتھ گزار سکتے تھے۔ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں ان کا کام اور خاص طور پر ان کی ٹھیکیداری جس عروج پر تھے صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان جیسے لوگ ان کے ذاتی دوستوں میں تھے اور ذاتی دوست کی حیثیت سے وہ اور ان کے اہل خانہ متعدد مرتبہ ان کے گھر آتے رہے۔ ان حالات میں ان کے لیے کوئی سیاسی عہدہ حاصل کرنا یا اپنی ذات کو پروان چڑھانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مگر ان کی دور بین نگاہیں جو حالات دیکھ رہیں تھیں وہ یکسر مختلف تھے۔ جس علاقے میں وہ رہائش پذیر تھے وہاں پر ان کا قبیلہ اور دیگر قبائل جس طرح کے اکثریتی مظالم کا شکار تھے اور ان کو جن حالات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا ان کے حل کے لیے کسی ایسے ہی مسیحا کی ضرورت تھی جو تمام تر حالات اور مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کر کے سب کے لیے جینے کے یکساں اسباب اور مواقع فراہم کر سکتا۔

آئے روز کے لڑائی جھگڑے، راستوں اور پانی کی بندش، سکول اور کالج کی سطح پر دیگر قبائل کے

بچوں کا استحصال کرنا، تھانہ کچہری کی سطح پر ان کی شنوائی نہ ہونا، الیکشن کے موقع پر اول تو ووٹ ہی نہ دینے دینا اور اگر دینا بھی ہو تو صرف اکثریتی جماعت و برادری کے حمایت یافتہ امیدوار کے حق میں دینا، تعلیم اور روزگار کے تمام سلسلے صرف مخصوص لوگوں کے لیے مخصوص ہونا یہ وہ حالات تھے جن میں سردار مولوی محمد صادق خان نے لوگوں کے درمیان رہ کر ان تمام مشکلات سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ اول اول تو ان کو اس راستے میں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، کئی طرح کی مشکلات آئیں جن سے ان کو گزرنا پڑا۔ اس سب کے باوجود ان کے پایہ ثبات میں کمی نہیں آئی، وہ اپنی بات پر ڈٹے رہے، اپنے موقف پر قائم رہے اور صرف اپنی برادری کے نہیں بلکہ ہر اس مظلوم کے حق میں کھڑے ہوئے اور اس کے حق کے لیے آواز بلند کی جس کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے رفتہ رفتہ برف پگھلنا شروع ہوئی۔ آپ نے لوگوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا، انہیں باہم اتحاد کی لڑی میں پرونے کے لیے تحریک کی۔ دیگر قبائل اور ان کے درمیان اتحاد سے مقابلے کا رجحان پیدا ہونا شروع ہوا۔ بدلے کے برعکس معافی کے طرز عمل کو رواج دینا شروع کیا تو لوگ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے جو کل تک ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے وہ بھی ان کے اس طرز عمل کی وجہ سے ایک دوسرے کے قریب ہوئے۔ سب سے بڑھ کر انتخابی معرکوں کے موقع پر جب تمام قبائل کے اتحاد نے مل کر سیاسی سطح پر یک جہتی کا مظاہرہ کیا اور الیکشن میں ان کے حمایت یافتہ امیدوار کو کامیابی نصیب ہونا شروع ہوئی تو حالات میں تبدیلی آنا فطری سی بات تھی۔

سردار مولوی محمد صادق خان نے مقابلے کی بجائے مکالمے کو رواج دیا، لاٹھی اور گولی کے مقابلے میں مذاکرات اور مباحث کو ترجیح دی۔ متحارب اور بندوق بردار ہو کر آمنے سامنے پوزیشن سنبھالنے کے برعکس مذاکرات کی میز پر دلیل کے ذریعے اپنا موقف ثابت کرنے کو رواج دیا۔ تھانہ کچہری میں لوگوں کو بے جا مخالفانہ کیسوں میں الجھانے کے برعکس درست موقف رکھنے والے آدمی کی حمایت اور غلط موقف پر ڈٹے رہنے والے فرد چاہے وہ جس بھی قبیلے کا ہو کی مخالفت کی۔ جن گلیوں اور بازاروں میں مخالف قبیلے کے فرد کو آنے تک کی اجازت نہیں تھی وہاں خود کھڑے ہو کر ایک ایسا ماحول تشکیل دیا جس میں اپنا بیگانہ ہر ایک خود کو محفوظ سمجھ

سکے۔

گالی اور دشنام طرازی کی بجائے امن، محبت اور بھائی چارے کی بات کی اور اس عمل میں سب کو شریک کیا۔کل کے دشمنوں کو آپس میں شیر وشکر کیا بدلے کی سیاست کے مقابلے میں مفاہمت کی سیاست کو رواج دیا۔ سیاسی اثر و رسوخ اور طاقت حاصل کرنے کے باوجود مخالفین سے انتقام لینے کے بجائے انہیں معاف کرنے کو رواج دیا۔ یہ سردار مولوی محمد صادق خان کی وہ صفات تھیں جنھوں نے اپنے بیگانے ہر ایک کے دل میں ان کے لیے محبت اور احترام کا جذبہ پیدا کیا اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے علاقے کے مجموعی ماحول میں بہتری کے لیے اہم کردار ادا کیا اور وہی علاقہ جو ایک وقت میں رہنے کے حوالے سے مشکل ترین تصور ہوتا تھا بہترین جگہوں میں شمار ہونے لگا۔

کہتے ہیں کہ بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جس کی محفل میں کوئی خود کو کمتر یا چھوٹا نہ سمجھے اور بڑا صرف وہی نہیں ہوتا جو خود کسی مرتبے پر براجمان ہو جائے اور دوسرے اس کے آگے بونے معلوم ہوں۔ دنیا کی تاریخ ایسے واقعات سے عبارت ہے کہ جب کوئی شخص بڑا بنا، یا بنایا گیا تو اس نے اپنے مدمقابل کسی کو بھی نہیں آنے دیا حتیٰ کہ مدمقابل اگر باپ، بھائی یا اولاد ہی آئی تو انہیں بھی حرف غلط کی طرح اپنوں بیگانوں سب نے مٹا دیا مگر مولوی صادق اس حوالے سے اپنے پیش رووں سے مختلف اور منفرد ہیں کہ جب ان کو بڑا بننے کی دعوت دی گئی تو ایک بار نہیں کئی بار دستار فضیلت انہوں نے دوسروں کے سر پر رکھی۔ انہوں نے بادشاہ بننے کی بجائے بادشاہ گر بننے کو ترجیح دی۔ وہ اگر چاہتے تو وقتی مفادات حاصل کر سکتے تھے۔ اپنے بیگانے سب ان کے حامی و مددگار تھے۔ وہ ایک بار نہیں کئی بار ایوان اقتدار میں مسند اقتدار پر براجمان ہوتے اور ایسا کرنا غلط بھی نہ ہوتا۔ مگر انہوں نے وقتی مفادات کو قبول نہیں کیا۔

آج مولوی صادق ہم میں موجود نہیں، چھتر کلاس سے ڈنہ کچیلی روڈ پر ۲۵ کلومیٹر کے فاصلے پر کلیان شریف میں آسودہ خاک ہیں۔ وہ کلیان شریف جہاں ان سے پہلے انہی کے پیشرو بزرگ مولانا متن متین آسودہ خاک ہیں۔ اس خاندان کے فرد کی حیثیت سے مولوی محمد صادق خان کا منصب یہی بنتا تھا کہ وہ اس فیض کو جاری رکھیں سو انھوں نے عملاً اسے جاری کر کے اپنے پرکھوں کے مشن کی لاج رکھی۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں

کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کے مخالفین نہ ہوں مگر ایک ایسا شخص جس کی اپنے بیگانے سب تعریف کرتے ہوں کم کم دیکھا گیا ہے۔ سردار مولوی محمد صادق خان اس حوالے سے خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے مسالک، گروہ، ذات اور قبیلے سے باہر نکل کر جب ہر مظلوم کی آواز بنے تو آج اپنے بیگانے سب ان کی تعریف پر مجبور ہیں۔ اگرچہ آج مولوی محمد صادق خان ظاہراً دنیا میں موجود نہیں مگر وہ دلوں کی مسند کے مکیں ہیں ایک جذبہ، ایک امنگ ایک امید بن کر۔

☆☆☆

نسیمِ سحر

پروفیسر راجا نسیم شہید گورنمنٹ ڈگری کالج ڈنہ میں ٹرانسفر بھی زندگی کا عجیب اتفاق تھا۔ ڈگری کالج لیپہ سے ڈگری کالج ڈنہ کی ٹرانسفر بالکل ایسی تھی جیسے آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ ایک دور افتادہ ڈیوٹی اسٹیشن سے ایک اور دور افتادہ اسٹیشن پر وہ بھی ایسا جو کسی مین شاہراہ سے ہٹ کر مکمل طور پر مضافاتی علاقے میں بھلا کون خوشی سے یہ جلاوطنی قبول کرتا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق 'نوکر کی تے نخرہ کی' کی سوچ لیے لیپہ سے ٹرانسفر آرڈر ہاتھ میں لیا، ایک لمبی مسافت کے بعد رات مظفر آباد ٹھکانہ کیا اور صبح ہی صبح یار لوگوں سے بوجھتے پوچھتے ڈنہ کی گاڑی کے اڈے تک پہنچا گاڑی کا ٹکٹ لیا اور ڈنہ کے لیے عازم سفر ہوا۔

میری معلومات کے مطابق ڈنہ کی مظفر آباد سے مسافت لگ بھگ ۴۵ کلومیٹر کے لگ بھگ تھی اس لیے اندازہ یہ تھا کہ اگلے ایک گھنٹے میں مقام محمود منزل ہوگی۔ مگر یہ ایک گھنٹے کی مسافت تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ گاڑی کا نیم ڈاڑھی مونچھوں سے مزین ادھیڑ عمر سا ڈرائیور اپنے حلیے اور چال سے پچھلی صدی کا نادر نمونہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بارے میں یہ رائے اس وقت اور پختہ ہوگئی جب اس نے یہ مختصر سی مسافت پورے تین گھنٹے لگا کر طے کی۔ سڑک کے آس پاس چلنے والا کوئی ایک راہگیر ایسا نہیں ہوا ہوگا جس کے پاس گاڑی روک کر اس نے یہ نہ پوچھا ہو کہ ڈنہ چلیں گے۔ خواتین کے معاملے میں تو وہ گاڑی میں موجود سواروں کو اس طرح سارے راستے پھینٹتا تھا کہ ہر نئی سوار ہونے والی خاتون کی آمد پر ایک بار تمام لوگوں کو نیچے اتار کر نئی صف بندی کرواتا اس عورت کو سوار کراتا اور پھر باقی لوگوں کو دوبارہ بٹھا کر روانہ ہوتا۔ یہ کھیل اس سے پہلے خال خال ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اور یہ پہلا موقع تھا جو اس طرح سے سب کچھ ہوتا ہوا دیکھ بھی رہا تھا اور کسی دیوتا کی طرف چپ سادھے اندر ہی اندر خود کو کوس رہا تھا کہ کس مصیبت کو گلے لگایا ہے۔

خدا خدا کر کے یہ مسافت تمام ہوئی اور گاڑی سے اترنے کے بعد نئی جائے تعیناتی اگلی منزل جا ٹھہری۔ آس پاس کے لوگوں اور راہگیروں سے پوچھتا بالآخر کچھ دیر میں ڈگری کالج ڈنہ کے اندر موجود تھا۔ یہ

کالج سی جی آئی شیٹ سے بنی پرانی سی دو عمارتوں پر مشتمل تھا جو گردش زمانہ کے باعث اب کسی تعلیمی ادارہ کے برعکس کسی آسیب زدہ حویلی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ رہی سہی کسر زلزلہ ۲۰۰۵ کے بعد کے حالات نے مزید پوری کر دی تھی اور کالج کی رہتی سہتی کسر اور چولیں با قاعدہ ہلا کر رکھ دی تھی۔ زلزلہ کے بعد کے حالات میں جب ان پرانی عمارات کی جگہ نئی تعمیر شروع ہوئی تو اس ادارہ کی نئی عمارتیں بھی بننے لگیں لہٰذا ان پرانی عمارتوں سے تھوڑا سا نیچے نئی بننے والی عمارات کا ڈھانچہ عجیب طرح کا منظر پیش کر رہا تھا۔

یہ تین دسمبر کا دن تھا، ہوا میں ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس تھا اور اس احساس سے بچنے اور دھوپ سے مستفید ہونے کے لیے دفتر کے برعکس پرنسپل ادارہ کے لیے باہر برآمدے میں کرسی لگائی گئی تھی جس پر کالی شیروانی اور قراقرلی میں ملبوس ایک مولانا طرز کی شخصیت براجمان تھی جو بعد از اں رسمی تعارف پر پروفیسر راجہ محمد فرید خان پرنسپل ادارہ کے طور پر متعارف ہوئی۔ چند مزید کرسیاں آس پاس لگی ہوئی تھیں جن پر چند کالج اساتذہ دسمبر کی دھوپ کے مزے لے رہے تھے۔ جبکہ ان کرسیوں سے کچھ فاصلے پر ایک لمبا سے بینچ لگا ہوا تھا جس پر چار پانچ مختلف شکل وصورتوں اور ملی جلی عمروں کے لوگ بھی دھوپ سینک رہے تھے اور ساتھ ساتھ پرنسپل اور سٹاف کی آپس کی گفتگو بھی سن رہے تھے۔ یہ حلیے سے کالج کے مددگار سٹاف کے لوگ لگ رہے تھے اور حقیقتاً بھی ایسا ہی تھا۔

رسمی تعارف کے بعد جب انہیں یہ پتہ چلا کہ ان کے ایک ایڈ ہاک لیکچرار کی فراغت کر کے بعد مجھے تعیناتی کا آرڈر دیا گیا ہے تو ان سب کے رنگ بدلنے لگے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے اشاروں کنایوں میں بات ہونے لگی اور اپنے تائیں یہ طے کر لیا گیا کہ نئے آنے والے لیکچرار کو حاضر نہیں کرنا ہے اور سب نے مل کر ایڈ ہاک لیکچرار کی نوکری کا دفاع کرنا ہے۔ میں ان کی اس ساری منصوبہ بندی سے بے خبر نئی تعیناتی کے بعد کے حالات پر غور وحوض کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے مجھے پرنسپل آفس میں چلنے کے لیے کہا۔ پرانا سا ایک دفتر جس میں پرانی طرز کی دھول زدہ کرسیاں اور سامنے پرنسپل ادارہ کے لیے بڑی سی میز اور اس سے پیچھے ایک بڑی سی کرسی اور پیچھے دیوار پر قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ محمد اقبال کے بڑے سے پورٹریٹ اور ان کے درمیان اعزاز سرپرستی کا بڑا سا بڑا سا بورڈ جس پر ۱۹۷۱ سے لے کر تا حال تعینات ہونے

والے منتظمین ادارہ کے اسمائے گرامی خوشخط تحریر کیے گئے تھے۔ پرنسپل کی کرسی کے بالکل دائیں طرف ایک بڑی سی الماری جس پر نیلی چمکدار آنکھوں والی خوبصورت سی شخصیت کا پورٹریٹ جس کے نیچے پروفیسر راجا محمد نسیم خان کا نام تحریر کردہ تھا۔ یہ میرا راجا محمد نسیم خان سے پہلا غائبانہ تعارف تھا۔

دفتر میں بیٹھنے کے بعد چند مزید احباب بھی اندر آ گئے اور مجھے یہاں حاضر ہونے کی بجائے واپس نظامت کالجز میں رپورٹ کرنے کا مشورہ دینے لگے کہ پرنسپل ادارہ آپ کو یہاں حاضر نہیں کر سکتے اور وہ پہلے سے تعینات ایڈہاک لیکچرار حکیم شاہ کو کسی صورت فارغ نہیں کریں گے۔ میرا بھی چونکہ اتنے دور افتادہ علاقے میں سروس کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا اس لیے میں نے بھی اسے غنیمت جانتے ہوئے واپس نظامت میں رپورٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ کسی متبادل کالج میں ٹرانسفر ہو سکوں۔ یہ میرا اس ادارے اس کے پرنسپل اور اس کے سٹاف کے ساتھ پہلا تعارف تھا جو خوشگوار سے زیادہ نیم خوشگوار اور ملے جلے تاثرات کا حامل تھا۔ یہ الگ بات کہ اپنی سوچوں کے برعکس مجھے بعد کے حالات میں بذریعہ عدالت فیصلہ حاصل کرنے کے بعد نہ صرف یہیں حاضر ہونا پڑا بلکہ اگلے دس سال یہیں گزارنا پڑے۔

وہی پرنسپل جو پہلے مجھے یہاں حاضر کرنے پر تیار نہ تھے اب سب سے زیادہ مجھ پر اعتماد کر رہے تھے۔ ان کی شخصیت مجموعہ اضداد تھی، بظاہر درویش منش اور ہمیشہ شلوار قمیص کے ساتھ شیروانی میں ملبوس اور سر پر قراقلی مگر زندہ دل اور زندہ مزاج...... ان کا گھر کالج سے کوئی چار گھنٹے کی مسافت پر مظفر آباد کی طرف تھا اس لیے ان کا معمول یہ ہوتا کہ وہ عموماً جمعرات کو کالج حاضر ہوتے رات ہاسٹل میں قیام ہوتا۔ اگلے دن کلاسوں کے بعد نماز جمعہ کے لیے قریب ہی چھوٹے سے قصبے سہوتر میں ہم سب جاتے۔ وہ مسجد کے مولانا کی گفتگو کے دوران ایک چٹ ان کے ہاتھ میں تھماتے جس میں مجمع سے چند منٹ مخاطب ہونے کی درخواست ہوتی۔ پھر اجازت ملنے پر منبر پر آتے لوگوں کو مخاطب کرتے کہ لوگو! ڈگری کالج ڈنہ کا پرنسپل آپ سے مخاطب ہے۔ آپ اپنے بچوں کو باقاعدگی سے کالج بھیجیں۔ کچھ اور ملی جلی گفتگو کرتے اور بعد از نماز جمعہ مظفر آباد جانے والی گاڑی پر بیٹھتے اور مظفر آباد روانہ ہو جاتے۔ البتہ جو چیز ان کی شخصیت میں سب سے زیادہ دلچسپ اور میری پسندیدہ تھی وہ یہ تھی کہ جب بھی اس علاقے میں کوئی شادی یا جنازہ ہوتا وہ وہاں تشریف لے جاتے رسمی جملوں سے گفتگو کا

آغاز کرتے اور اتنی مربوط گفتگو کرتے کہ اگلے چند منٹوں میں سارے مجمع کو اپنا گرویدہ کر لیتے۔

بعد کے حالات میں یہاں تعیناتی کے دوران اکثر اوقات وہاں کے مقامی رفقاء سے مختلف موضوعات پر سیر حاصل بات ہوتی۔ادارے کی وجہ تسمیہ کے حوالے سے ابتدا میں ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ اسی کالج کے ایک سٹاف ممبر تھے اور دوران امتحان ڈیوٹی راولاکوٹ کے کسی امتحانی مرکز میں شہید کر دیے گئے تھے۔رفتہ رفتہ جب تفصیل سے ان کے حالات زندگی اور ان کی مدت ملازمت کے دوران ان کا طرز عمل اور طرز رہن سہن کا پتہ چلا کہ کس طرح وہ اپنے ہم عصروں سے جدا تھے تو تجسس،شوق اور لگن نے ان کی شخصیت کے کئی جوہر آنکھوں کے سامنے لا کر رکھ دیے۔

ادارے کے ایک سٹاف ممبر جو ان کے دور تعیناتی میں پہلے اسی ادارہ کے بطور طالب علم حصہ رہے اور بعد ازاں ملازمت کا آغاز بھی اسی ادارہ سے کیا وہ ایک دن دوران واک پروفیسر راجا نسیم کی زندگی کے گوشے یوں وا کرنے لگے کہ سب منظر کھل کر سامنے آ گئے۔ان کے بقول دوران طالب علمی کالج میں نئے آنے والے اسلامیات کے پروفیسر کے بارے میں سنا تو پہلا تصور یہی تھا کہ سفید شلوار قمیص،سیاہ شیروانی اور قراقلی میں ملبوس لمبی سی ڈاڑھی اور بھاری بھرکم توند والی کوئی شخصیت ہو گی مگر اُس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب نئے آنے والے پروفیسر صاحب دراز قد،درمیانی عمر،باریک مونچھیں،نیلی چمکدار آنکھیں،سلیقے سے سنوارے ہوئے بال،توند کا نام ونشان تک نہیں ہاتھ میں چھڑی شکل سے ایک دم فوجی ہماری کلاس میں داخل ہوئے۔یہ حقیقت ہم پر بعد میں منکشف ہوئی کہ

فوج سے نکلا ہوا ہوں میں عشق ہے فوجی مرا

کے مصداق واقعتاً وہ فوج چھوڑ کر تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوئے تھے۔جی ہاں یہ شخصیت راجہ محمد نسیم خان کی تھی جو آرمی کی ایجوکیشن کور میں تئیس سال بطور صوبیدار نوکری کر کے سول سروس میں آئے اور تھوراڑ کالج سے ٹرانسفر ہو کر نئے نئے ہمارے کالج میں آئے تھے۔یہ تو ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ اُن کا تعلق بھی ایک دوسرے گاؤں کوٹ سے ہے اور وہ صبح کالج کے پاس سے گزرنے والی پہلی گاڑی پر باقاعدگی سے کالج آتے تھے۔ہم نے اسلامیات کے پروفیسر کے بارے میں جتنے بھی اندازے لگا رکھے تھے وہ سارے اگلے چند ہی دن میں

غلط ثابت ہوگئے اور ہمارا کالج جو آج تک شاید کسی نظم کے تابع ہی نہیں تھا ان کے آنے سے یک دم کسی فوجی چھاونی کا منظر پیش کرنے لگا۔

نئے پروفیسر صاحب ایک تو راجپوت، دوسرے فوجی صوبیدار اور تیسرے مزاج کے سخت اپنے نام کے برعکس نسیم سے زیادہ صمیم بلکہ اکثر معاملات میں بادصموم، نظم وضبط پر کسی بھی صورت کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ اپنی اس طبعیت اور سخت ڈسپلن کے باعث تھوڑے عرصہ میں وائس پرنسپل کی کرسی پر براجمان ہو گئے اور ایسے جم کر بیٹھے کہ مجال ہے کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہو۔ مختصراً یہ کہ وہ جتنا عرصہ کالج میں رہے پرنسپل اور دیگر سٹاف کبھی بھی ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ کر سکتا تھا۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ لوگ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کرتے تھے۔ یہی بات پرانی دہلی میں ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ اور رائے بہادر پیارے لال کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے کہ یہ تینوں روزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں تین مختلف سمتوں سے آنے کے باوجود ایک ہی وقت میں پہنچتے۔ مجال ہے کہ کسی بھی طرح کا موسم ہو اور وہ ایک منٹ بھی لیٹ ہو جائیں۔ اس کے بعد اگر یہ بات کسی پر صادق آتی ہوئی نظر آتی ہے تو وہ پروفیسر راجا محمد نسیم خان کی ذات تھی۔

اُن کے رعب داعب کا یہ عالم تھا کہ عملاً اگرچہ وہ بطور لیکچرار ٹرانسفر ہو کر اس ادارہ میں آئے تھے مگر ان کی موجودگی میں پرنسپل ادارہ کے حوالے سے کوئی بھی اقدام کرنے سے پہلے ان سے رائے ضرور لیتا۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کے عرصہ تعیناتی کے دوران ہر فیصلہ ان کی رائے اور مرضی کے مطابق انجام پاتا۔ ان کا چونکہ آرمی بیک گراؤنڈ تھا اور اس نسبت سے وہ نظم وضبط کے حوالے سے کسی بھی طرح کی نرمی کے قائل نہیں تھے۔ خود بھی نظم ونسق کی مکمل پاسداری کرتے اور دوسروں سے بھی اس کی پابندی کراتے۔ اس لیے کالج کے ڈھیلے ڈھالے ماحول میں بہت کم عرصہ میں ہی ان کا مکمل کنٹرول ہوگیا۔

یاد نہیں کہ ہمارے کالج میں اپنے چھ سالہ قیام کے دوران وہ کبھی غیر حاضر رہے ہوں یا کبھی لیٹ آئے ہوں۔ ہمیشہ ہاتھ میں چھڑی لیے ہوئے کالج کے پاس سے گزرنے والی پہلی بس سے بروقت آ کر گیٹ

کے سامنے اُترتے۔ دو چپڑاسی ہمہ تن ان کے استقبال کے لیے حاضر ہوتے ایک اُن کے ہاتھ سے چھڑی لیتا اور دوسرا پانی کا لوٹا اُن کو تھماتا۔ کالج پہنچ کر سب سے پہلے وضو کرتے، کچھ دیر تلاوت کرتے اور پھر چھڑی سمیت درسِ قرآن دینے کلاس میں پہنچ جاتے۔ کوئی طالب علم اگر ایک دن غیر حاضر ہو جاتا یا اُسے سبق تیار نہ ہوتا تو اُسے دوسرے دن ایسی سزا ملتی کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔ ہم دعا کرتے کہ وہ بیمار پڑ جائیں مگر ہماری دعائیں اُن پر اُلٹا اثر کرتیں اور وہ اور نکھر کر ہمارے سامنے آتے۔

ایک دن ہمارے ایک کلاس فیلو نے بتایا کہ نسیم صاحب کے بھائی کی شادی ہے اور وہ مجبوراً چھٹی کریں گے لہذا ہفتہ کو ہماری عید ہو گی مگر ہماری ساری خوشی اُس وقت خاک میں مل گئی جب موصوف ہفتہ کو حسبِ معمول پہلی گاڑی پر کالج پہنچ گئے۔ ہماری کلاس شروع ہوئی تو میں نے ڈرتے ڈرتے اُن سے پوچھا کہ آج تو آپ کے بھائی کی شادی تھی آپ اس میں شرکت نہیں کر رہے؟ کہنے لگے بچوں کی تعلیم کا حرج ہوتا تھا اس لیے بارات کا ٹائم چھٹی کے بعد رکھا ہے تب تک میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد ان سے مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں رہی۔

کچھ عرصہ بعد کی بات ہے ہم کالج جا رہے تھے کہ قریبی مسجد سے اعلان ہوا کہ پروفیسر نسیم صاحب کے والد قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے ہیں، نماز جنازہ بعد از نماز ظہر ان کے آبائی گاؤں میں ادا کیا جائے گا۔ ایک لمحے کے لیے ان کی ناگہاں موت کا افسوس ہوا مگر اندر ہی اندر ایک احساس طمانیت بھی تھا کہ آج تو کالج میں اپنی حکومت ہو گی اور ان سے جان چھوٹے گی۔ ہم کالج پہنچے تو تھوڑی ہی دیر میں نسیم صاحب بھی گیٹ سے اندر داخل ہوئے ہر قسم کے احساسات سے عاری وہی سپاٹ چہرہ، وہی نیلی چمکدار آنکھیں۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے اُن سے تعزیت کی اور پوچھا کہ آج تو چھٹی کر لیتے؛ کہنے لگے نماز جنازہ کا ٹائم دو بجے ہے میں تب تک گھر پہنچ جاؤں گا۔ میری چھٹی سے طلبہ کا حرج ہو جاتا۔

ایک ایسا معاشرہ جہاں کم علمی، لاعلمی بلکہ بعض معاملات میں جہالت کا دور دورہ ہو کسی با اصول آدمی کا ہونا اور اپنے اصول پر ڈٹ جانا کتنا مشکل ہو سکتا ہے اس کا اندازہ وہی صاحب بصیرت کر سکتا ہے جو اس ساری صورتحال سے گزرا ہو۔ مگر یہاں صورت حال یہ تھی کہ ایک ایسا بندہ جس کے اپنے وضع کردہ اصول ہی

اس کے لیے سب کچھ ہوں اور جن کی خاطر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا ہو بھلا کوئی کہاں تک مقابلہ کرتا۔ تعلیمی سیشن کی تکمیل پر سالانہ امتحانات کا آغاز ہوا اور حسب معمول ہمارا کالج ہی امتحانی مرکز قرار پایا۔ ایک ایسا سنٹر جس میں برائے نام امتحان ہوتا۔ پوری ریاست سے بوٹی مافیا والے اس ادارے کو بطور مرکز صرف اس لیے رکھواتے تھے تاکہ بغیر محنت کے کامیاب ہوسکیں۔

جب پرچہ شروع ہوتا تو اندر کم امیدواران ہوتے اور باہر کئی گنا زیادہ حامی و مددگار جن کا کام پرچہ شروع ہونے سے لے کر اختتام تک نہ صرف امتحانی عملے کا اچھا خیال رکھنا بلکہ متعلقہ امیدواران تک بوٹی کی بروقت ترسیل کے ساتھ ساتھ منظور نظر امیدواران کو مخصوص کمروں میں بٹھا کر اعلانیہ امداد دینا اور پرچہ حل کروانا ہوتا۔ اس سارے عمل میں امتحانی عملے کی طرف سے کسی قانون کے تحت پرچہ حل کرنے کا مطلب امتحان شروع ہونے سے قبل ہی اُن کو بین السطور بتا دیا جاتا۔

مگر اب کی بار منظر ہی کچھ اور تھا، نسیم صاحب بطور ریذیڈنٹ انسپکٹر اس امتحان میں موجود تھے۔ نسیم صاحب نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ اُن سب مددگاروں اور بوٹی مافیا کے حامیوں کو گیٹ سے باہر کیا جو براہ راست دخل اندازی کرتے تھے۔ اس کے بعد امتحانی مرکز میں بطور ریذیڈنٹ انسپکٹر ایسا ہاتھ ڈالا کہ اپنے بیگانے سب کو برابر کر دیا۔ امتحانی ہال میں امیدواران اس نئی صورت حال کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ جب ان کو سب کچھ ہاتھ سے جاتا دکھائی دیا تو باولے ہو گئے اور کچھ ایسے حملہ آور ہوئے کہ اپنے بیگانے کی تمیز نہ رہی۔ کرسیاں چل گئیں، نسیم صاحب کو بہت چوٹیں آئیں مگر وہ کہاں پسپا ہونے والے تھے اسی حال میں مرکز کے اندر بیٹھ کر سارے امتحانی عمل کی نگرانی کرتے رہے۔ صرف یہی نہیں دوسرے ٹائم جب پرچہ شروع ہوا تو دوبارہ آن ٹپکے۔ کسی نے کہا کہ آپ کو آرام کی ضرورت تھی نہ آتے۔ کہنے لگے فرض میں کوتاہی کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور اس لیے بھی آیا ہوں کہ ان سب کو پتا چل سکے کہ میں ان کی بزدلانہ حرکتوں سے بھاگنے والا نہیں ہوں۔

یہ صورت حال ایک بار نہیں کئی بار ہوئی، عوام علاقہ ان کی اس سختی پر شدید مزاحم ہوئے، حملہ آور ہوئے مگر انہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی نتیجتاً سب کو ہار ماننا اور معافی مانگنا پڑی۔ ایک دفعہ کچھ ایسا ہوا کہ اُن کی اپنی بہن سے دوران امتحان مواد برآمد ہوا تو ناظم امتحان کو کیس بنانے کا کہا۔ ناظم نے ریذیڈنٹ انسپکٹر کی بہن

سمجھتے ہوئے رعایت کرنا چاہی تو سخت خفا ہوئے اور اسے کہا کہ اگر تم نے کیس نہ بھیجا تو میں تمہارے خلاف لکھوں گا اس طرح ناظم امتحان کے کیس بنانے پر بیچاری بہن تین سال کے لیے امتحان سے باہر ہوگئی۔

اپنے مزاج کے خلاف کوئی بھی بات وہ کبھی برداشت نہ کرتے چاہے اس کی جو بھی قیمت ان کو چکانا پڑتی۔ان کا معمول تھا کہ وہ کلاس میں اپنی چھڑی لے کر جاتے اور طلبہ کی غلطی یا شرارت پر اسی چھڑی سے ان کو سخت سزا بھی دیتے۔کچھ طلبہ اور ان کے والدین اس بے جا سختی پر خاموش نہ رہ سکے اور ان کے خلاف نظامت تعلیم میں شکایت کر دی۔اس معاملہ کی انکوائری کے لیے جب انکوائری آفیسر کالج میں پہنچا تو حسب معمول نسیم صاحب کلاس ختم کر کے اپنی چھڑی سمیت کلاس سے باہر آ رہے تھے۔دونوں کا جب آپس میں آمنا سامنا ہوا اور ڈائریکٹر کے عہدے کے انکوائری آفیسر نے ان کو دیکھ کر براہ راست سوال پوچھا کہ آپ کون ہیں اور آپ کے ہاتھ میں یہ چھڑی کیوں ہے؟ اس پر نسیم صاحب چپ رہے مگر دوسری بار بھی جب اس نے اسی لہجے میں سوال کیا تو خاموش نہ رہ سکے اور اسی چھڑی کے ساتھ ڈائریکٹر کی پٹائی کر دی کہ آپ کون ہوتے ہیں جو بجائے اس کے کہ آ کر اپنا تعارف کرائیں مجھ سے تعارف پوچھ رہے ہیں۔وقتی طور پر معاملہ رفع دفع کیا گیا مگر اس وجہ سے ان کی اعلیٰ سطح کی انکوائری شروع ہوگئی۔نیا انکوائری آفیسر جب کالج میں پہنچا تو عوام کا جم غفیر ان کی حمایت میں نکل آیا مجبوراً انکوائری کو روکنا پڑا اور اُن کے خلاف کسی طرح کی کوئی کارروائی نہ ہوسکی۔

اس بے جا سختی کے ساتھ ساتھ دوسروں کو اگر تکلیف میں دیکھ لیتے تو فوراً دل نرم پڑ جاتا۔ایک بار کلاس میں گئے تو ایک لڑکے کو دیکھا جو پاؤں میں پلاسٹک کے سلیپر پہنے ہوئے تھا۔اس پر کلاس کے نظم وضبط کے خلاف جانتے ہوئے اس طالب علم کو شدید سزا دے دی۔بے چارہ طالب علم ان کے سامنے تو کچھ نہیں بولا اور چپ چاپ مار کھاتا رہا مگر اس تشدد اور دل شکنی پر سارا دن روتا رہا۔

کسی نے اس کے اس طرح رونے کی اطلاع ان تک پہنچائی تو انہوں نے جب معلومات حاصل کی تو پتہ چلا کہ مذکورہ طالب علم کا تعلق غریب گھرانے سے ہے اور وہ جوتے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔اس پر انہوں نے اسی وقت جیب سے پیسے نکال کر ایک چپڑاسی کو دیے کہ اس طالب علم کو ساتھ لے جاؤ اور بازار سے نیا جوتا خرید کر دو۔اس سارے عرصہ میں ان کی یہ سختی کسی ذاتی بغض وعناد کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ان

تمام تر معاشرتی خرابیوں کے خلاف تھی جن کی وجہ سے اصلاح کا عمل مکمل طور پر رکا ہوا تھا۔طلبہ کے ساتھ ان کی سختی صرف اور صرف اصلاحی نقطہ نظر سے ہوتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ ان کے چھ سالہ دور تدریس میں جو بھی طلبہ کالج سے فارغ ہوئے وہ سب اپنے اپنے شعبہ جات میں نمایاں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

دوستوں نے کئی بار اُن سے اس سخت طبعیت اور بے جا سختی کو ترک کرنے کا مشورہ دیا مگر وہ کہاں ماننے والے تھے جس بات کو کرنے کا فیصلہ کر لیتے کبھی پیچھے نہ ہٹتے۔کئی بار اس بے جا سختی سے ان کے ساتھ کام کرنے والوں، ماتحتوں اور دیگر لوگوں کی دل آزاری بھی ہو جاتی۔مگر انہیں اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہ ہوتی۔ان کے لیے اصول سے بڑھ کر کوئی چیز نہ تھی۔چاہے سارا گاؤں ایک طرف اور وہ اکیلے ایک طرف کیوں نہ ہوں۔

نسیم صاحب امتحانی ڈیوٹی پر کم کم جاتے تھے۔اکتوبر ۱۹۹۸ء کی بات ہے آزاد کشمیر یونیورسٹی کے زیر اہتمام بی اے، بی ایس سی امتحان کی ڈیوٹی کے لیے امتحانی مرکز راولاکوٹ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔جو دوست احباب ان کے مزاج سے واقف تھے انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ وہاں ڈیوٹی نہ کریں کسی اور مرکز کا انتخاب کر لیں مگر وہ کہاں ماننے والے تھے ڈیوٹی پر چلے گئے۔

دوران امتحان جب اپنے مزاج کے عین مطابق درست طریقے سے امتحان لینا چاہا تو امیدواران مزاحم ہو گئے۔وقتی مصلحت یا حالات کے مطابق فیصلہ کرنے کے برعکس اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا۔شاید کوئی نہ بتا سکے کہ امیدواران کیا چاہتے تھے اور وہ ان پر کیوں حملہ آور ہوئے مگر ان کا یہ حملہ ایسا کارگر ہوا کہ وہ مرد جری جو جب تک فوج میں رہا دشمن کے خلاف سینہ سپر رہا، جب محکمہ تعلیم میں آیا تو اپنی بساط کے مطابق اصلاح کے لیے ہمہ تن کوشاں رہا مقامی کالج ہونے کے ناطے سے جتنی خرابیاں تھیں ان کی اصلاح اور بہتری کے لیے دن رات ایک کرتا رہا اس حملے کی تاب نہ لا سکا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

مجھے کسی کام کے سلسلہ میں جامعہ پونچھ جانے کا اتفاق ہوا وہاں کسی نے میرا تعارف گورنمنٹ ڈگری کالج ڈنہ کے پروفیسر کی حیثیت سے کرا دیا۔اس پر وہاں موجود بہت سے لوگ یک دم متوجہ ہو گئے اور مجھ سے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ایک صاحب کا تعارف کرایا گیا کہ ان کے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں ڈنہ کالج کے پروفیسر نسیم صاحب کا سانحہ ہوا۔ان کے بقول نسیم صاحب نے دن کو پرچہ کے دوران ایک امیدوار سے

نقل کرنے کی پاداش میں پرچہ بھی لے لیا، اس کے خلاف ناجائز مواد کا کیس بھی بنایا اور تھانہ میں اس کے خلاف ایف آئی آر بھی درج کرادی۔ شام کو وہ امیدوار اپنے ساتھیوں سمیت کالج ہاسٹل میں نسیم صاحب کے پاس آیا اور تین میں سے ایک سزا دے کر باقی دو سزائیں موقوف کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر نسیم صاحب اور ان امیدواران کے درمیان تلخی ہوگئی۔ نسیم صاحب نے ایک امیدوار کو قابو کرلیا کہ تمہیں حوالہ پولیس کرتا ہوں۔ اس پر اس کے دوسرے ساتھی نے خنجر سے نسیم صاحب پر وار کیا جو کارگر ہوا اور وہ وہیں گر پڑے۔ بروقت طبی امداد نہ ملنے اور زیادہ خون بہہ جانے کے باعث جانبر نہ ہوسکے۔

وجہ جو بھی تھی پروفیسر راجہ محمد نسیم جیسا دلیر اور نڈر استاد یقیناً شعبہ تعلیم کا وہ قیمتی اثاثہ تھا جس نے کم وقت میں معیارِ تعلیم کی بہتری کے لیے مقدور بھر اقدامات کیے۔ ہر طرح کی مشکلات کا مقابلہ کیا، کسی بھی طرح کی کسی مداخلت کی پرواہ نہ کی۔ مکمل لگن اور دیانتداری سے کالج کے ماحول کو بہتر کرنے کے لیے اقدامات کیے اور ادارے کو اس نہج تک پہنچا دیا جہاں وہ ایک بہترین تعلیمی ادارے کے طور پر معروف ہے۔ پروفیسر راجہ محمد نسیم خان اس گھٹن زدہ ماحول کے لیے وہ نسیم سحر تھے جن کی جدوجہد نے تازہ ہوا کے جھونکے کا کردار ادا کیا۔

ان کے جانے کے بعد مجھے اور پروفیسر راجا عثمان خان کو اس ادارہ میں ایک ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ ہمارا یہ ساتھ کوئی ایک دو دن کا نہیں تھا بلکہ میرے اس ادارہ میں دس سال اور ان کے سات سال ایک ساتھ کام کی صورت میں تھا۔ میں نے جب اس ادارہ میں اپنے کام کا آغاز کیا تو وہاں چار کلاسوں میں طلبہ کی کل تعداد 19 تھی اور جب دس سال بعد وہاں سے ٹرانسفر کی صورت میں واپس لوٹا تو وہاں 430 سے زائد طلبہ تھے جن میں سے نصف سے زائد تعداد طالبات کی تھی اور مظفرآباد ڈویژن میں سالانہ نتائج کے اعتبار سے ماڈل سائنس کالج کے بعد اولین ادارے کے طور پر ہر سال یہ ادارہ نمایاں ہے۔

جس محنت اور لگن سے اس ادارے کے انتظام اور انصرام کے لیے پروفیسر راجا محمد نسیم خان کوشاں رہے وہ اپنی زندگی میں تو شاید اس کو نہیں دیکھ پائے مگر ہم دونوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اس ادارے پر عوام الناس کا اعتماد ہر صورت بحال کیا جائے اور آج وہ اعتماد طلبہ کی کثیر تعداد اور ان کے انٹرمیڈیٹ اور یونیورسٹی کی سطح کے نتائج اور ہم نصابی سرگرمیوں میں کامیابیوں اور اعزازات کی صورت میں بحال ہے۔ آج اگر اس ادارے کا نام پروفیسر راجہ محمد نسیم کے نام پر رکھا گیا ہے تو یہ ایک استاد کی اپنے پیشے اور ادارے کے ساتھ لگن کا اعتراف ہے۔

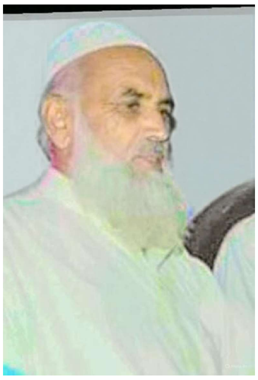

مولانا صاحب

عباسی خلیفہ مامون کا دربار پوری شان وشوکت سے آراستہ تھا ، آج معمول سے زیادہ چہل پہل تھی اور کیوں نہ ہوتی فرقہ معتزلہ کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے معتزلی علماء پوری تیاری کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔اُن کے چہروں کا اعتماد بتارہا تھا کہ بادشاہ وقت کی مدد اور حمایت اور فلسفیانہ موشگافیوں سے وہ فرقہ معتزلہ کی دھاک بٹھا کر دم لیں گے۔دوسری طرف مناظرے کے لیے جس شخصیت کو آج کٹہرے میں پیش کیا جارہا تھا وہ ایک سادہ سے درویش صفت بزرگ امام احمد بن حنبل تھے جو پچھلے کئی مہینوں سے تمام تر اذیتوں ،تشدد اور تکالیف سہنے کے باوجود اپنے موقف پر سختی سے کاربند تھے۔آج بھی حسب معمول مناظرہ شروع ہوا،معتزلی علماء کے بڑے بڑے فلسفیانہ دلائل کے جواب میں امام صاحب نے سادگی سے اسلام کی حقانیت پر بات کی۔فتنہ خلق قرآن کو باطل قرار دیا اور ایک جملے سے عباسی خلیفہ،اُس کے مصاحبین اور معتزلی علماء اور عوام کی زبانیں بند کردیں کہ ''ہمارے جنازے اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ ہم میں سے حق پر کون تھا۔''

آج جب میں مولانا عبدالرؤف آف تھب کے تعزیتی ریفرنس میں شرکت کرنے کے لیے آرہا تھا تو میرے ذہن میں مولانا مرحوم کے جنازے کا منظر بار بار گھوم رہا تھا۔عوام الناس کا ایک جم غفیر، کیا اپنے کیا بیگانے ، کیا قرب کیا دوری ، کہاں ایک دور دراز دیہی علاقے سے تعلق رکھنے والی ایک درویش منش بزرگ شخصیت اور کہاں اُن سے اتنی گہری محبت اور عقیدت رکھنے والے وہ سینکڑوں ، ہزاروں عقیدت مند جو سفری صعوبتوں ، راستے کی دشواریوں اور موسم کی ناہمواریوں کے باوجود صرف اور صرف اپنے محسن و مربی کے اس آخری سفر میں اپنی عقیدتوں کے پھول نچھاور کرنے حاضر ہورہی ہے تو میرے ذہن میں فوراً امام زماں احمد

بن حنبل کا وہ تاریخی جملہ آ گیا کہ ہمارے جنازے اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ ہم میں سے حق پر کون تھا۔

باغ شہر سے دو کلومیٹر راولپنڈی روڈ پر ایک سڑک نعمان پورہ بازار سے نصف کلومیٹر پہلے دائیں طرف نکلتی ہے۔ یہ سڑک معروف قصبے ملوٹ اور رنگلہ کو باغ شہر سے ملاتی ہے۔ اس سڑک پر آپ سفر کریں تو 25 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک تاریخی قصبہ واقعہ ہے جو یہاں آباد اکثریتی قبیلے تھکیال کی نسبت سے تھب تھکیالاں اور تھب مہدی خان کہلاتا ہے۔ مولانا عبدالرؤف کا تعلق اسی قصبے تھب سے تھا۔ اس گاؤں کی خاص بات یہ ہے کہ یہ علاقہ تاریخی اعتبار سے بہت ذرخیز گزرا ہے۔ خاص طور پر اس علاقے نے روحانی سطح پر ایک سے بڑھ کر ایک ایسی روحانی شخصیت پیدا کی جس میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی سطح پر بھرپور نام کمایا۔

پروفیسر یعقوب شاہق نے اپنی کتاب فیض الغنی میں اس علاقے کی انہی بزرگ ہستیوں کو محفوظ کیا ہے۔ مولانا عبدالرؤف نے یہاں رہتے ہوئے ابتدائی دینی تربیت حاصل کی اور بعد ازاں مختلف تعلیمی اداروں سے ہوتے ہوئے تعلیم کی تکمیل کے بعد عملی زندگی میں تدریس سے وابستہ ہوئے۔ ان کی یہ وابستگی ان کے آخر وقت تک یوں ہی جاری وساری رہی۔ اسی طرح جس دینی اور روحانی فیض کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری ابتدائی عمر سے شروع کی اس میں کبھی کمی نہ آئی حتیٰ کہ زندگی کے اس سفر کی شام ہوگئی۔ اس سفر زندگی میں ان کے مونس و رفیق ان کے بھائی مولانا عبدالشکور خود بھی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور روحانیت اور فقاہت میں اپنی الگ پہچان رکھتے تھے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ بطور تحصیل و ضلع مفتی لمبے عرصہ تک اہل باغ ان کی ان مذہبی خدمات سے اکتساب حاصل کرتے رہے

اس کائنات ارضی پر بسنے والے کروڑوں اربہا انسانوں میں سے بہت کم تعداد اُن لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں سلیم الفطرت کہا جاتا ہے ان میں سے پہلا نمبر تو انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے پھر ان کے اصحاب، پھر سلف الصالحین اور صالحین آتے ہیں۔ دین اسلام جہاں کائنات ارضی پر زندگی گزارنے کے اصول و مجموعے یا دوسرے لفظوں میں آئین وضابطے کا نام ہے تو دوسری طرف اسے دین فطرت کہا جاتا ہے گویا زندگی گزارنے کا وہ اصول وضابطہ جو انسانی فطرت کے عین مطابق تشکیل دیا گیا ہے۔ ہدایت کے متلاشی لاکھوں انسانوں جن میں یہ فطرت سلیم پائی جاتی ہے اگر زندگی کی ابتدا میں کسی غلط راستے پر گامزن ہو بھی جائیں تو زندگی کے کسی

ایک لمحے میں جہاں آوازِ حق ان کی فطرت تلاش حق کے ساتھ ٹکراتی ہے تو وہ ایک دم پلٹتے ہیں اور باطل کی تمام چکا چوند چھوڑ کر حق کے ساتھ آ جاتے ہیں۔

ماضی بعید کے صالحین میں اس کی ایک مثال مشہور صوفی بزرگ فضیلؒ بن عیاض کی زندگی ہے جو ایک زمانے میں بغداد کے سب سے بڑے قزاق جانے جاتے تھے اور ایک زمانہ اُن سے ڈرتا اور خوف کھاتا تھا مگر ایک رات جب شب باشی کے لیے وہ ایک عورت کے کوٹھے پر جا رہے تھے کہ قریبی مسجد سے کسی قاری کی خوش الحان آواز میں قرآن کریم کی یہ آیت سنائی دی:

ترجمہ: ''کیا اہل ایمان پر وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کی یاد کے لیے جھک جائیں''

تو خشیت الٰہی سے ایک دم ایسے پلٹے کہ ذلت کی پستیوں سے اُٹھ کر عزتوں کی اُن رفعتوں اور بلندیوں پر جا پہنچے کہ وقت کے بڑے بڑے علماء کسب فیض اور دینی راہنمائی کے لیے اُن کے پاس حاضر ہوتے۔ اس کی تازہ مثال پاکستان کے ماضی کے معروف گلوکار کی حیثیت سے اپنی فنی زندگی کا آغاز کر کے شہرت کی انتہا پر پہنچ کر آوازِ حق پر لبیک کہتے ہوئے پلٹ کر آنے والے جنید جمشید کی ہے جو اپنا سب کچھ ترک کر کے دین کے ساتھ ایسے وابستہ ہوئے کہ ایک عالم اُن کی وفات پر ماتم کناں پایا اور ان کے جنازے میں وقت کے بڑے بڑے علماء کو روتا دیکھا گیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف آوازِ حق کے متلاشیوں کی بڑی تعداد وہ بھی ہے جو ابتدا سے ہی اپنی حقیقی منزل کی طرف گامزن ہوتی ہے۔ میں اپنی شعوری زندگی کے اُن شب و روز پر جب غور کرتا ہوں کہ جن میں مولانا عبدالرؤف کو دیکھا، جانا، پہچانا اور اُن کے مقام و مرتبے کو سمجھنا شروع کیا تو بے ساختہ دل پکار اُٹھا کہ

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پہ گایا نہیں جاتا

بلاشبہ ایام طفولیت سے زمانہ طالب علمی، جوانی، سنجیدہ عمر اور بڑھاپا عشق الٰہی اور محبت و اطاعت رسول کا جو جام اُنھوں نے پیا اُن کے ہر ایک عمل سے عمر بھر عیاں رہا، جو محبت و اطاعت، جو زہد و تقویٰ، جو عبادت و ریاضت، جو امانت و دیانت، جو صداقت و شرافت ان کے دل و دماغ میں بس گئی وہ انہی کی ذات کا خاصہ تھی۔ جس خطہ، جس قبیلہ اور جس گھرانے سے اُن کا تعلق تھا اس میں دین کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی

ہے۔مولانا عبدالرؤف کی زندگی میں کسی اتفاقی واقعے یا حادثے سے یہ فکری انقلاب نہیں آیا بلکہ ایک علمی گھرانہ ہونے کی وجہ سے دین کی محبت ان کی سرشت میں شامل تھی اور زندگی کی آخری سانس تک قائم رہی۔

متفق علیہ ایک حدیث نبوی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ایک شخص جنتیوں والے کام کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر لکھا غالب آ جاتا ہے اور وہ دوزخیوں والا کام کرتا ہے اور اس میں داخل ہوجاتا ہے اور بے شک تم میں سے ایک شخص دوزخیوں والے کام کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر لکھا غالب آ جاتا ہے اور وہ جنتیوں والا کام کرتا ہے اور اس میں داخل ہوجاتا ہے۔آپؐ نے جب یہ ارشاد فرمایا تو بہت سے صحابہ پریشان ہو گئے کہ جب سب کچھ تقدیر میں لکھا ہوا ہے تو پھر دین کے راستے میں محنت کوشش کیا معنی رکھتی ہے تو آپؐ نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ جس کی تقدیر میں اچھائی لکھی ہوتی ہے اللہ اس کے لیے نیکی کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

اس حدیث نبوی کے تناظر میں جب مولانا مرحوم کی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو آغاز سے اختتام تک ایک تسلسل، دین سے محبت اور فکر آخرت دکھائی دیتی ہے جہاں کوئی وقتی حادثہ یا واقعہ ان کے دین وایمان کو متاثر نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اللہ کی رضا کے ساتھ راضی رہے اور اعمال کا دارومدار اس کے حسنِ خاتمہ پر ہوتا ہے کے مصداق اسی پر اختتام بھی ہو گیا۔

آپ میری اس بات سے کی تائید اور اتفاق کریں گے جو ایک آفاقی سچائی ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کے تمام اعمال ساقط ہو جاتے ہیں سوائے اولاد صالح،علم نافع اور صدقہ جاریہ کے۔اس کسوٹی پر جب میں مولانا کی زندگی کو پرکھتا ہوں تو تینوں حوالوں سے اُن کو خوش قسمت پاتا ہوں۔عمر عزیز کا بڑا حصہ جس شعبے کے ساتھ انھوں نے گزارا، ہزارہا علماء،حفاظ،قراء اور ان کے تلامذہ اس علم نافع کی ترویج واشاعت میں مگن ہیں اور ان کے نامہ اعمال میں حصہ ڈال رہے ہیں۔مساجد و مدارس سے محبت، مدرسہ امدادالاسلام کی بنیادوں سے تکمیل اور آج تک اس کے فیض عام سے کون ذی شعور انکار کر سکتا ہے۔مجھے یقین ہے کہ اسی طرح جن جن دینی اداروں کی بنیادوں اور تکمیل میں مولانا کا ہاتھ رہا ہوگا ان کا سارے کا سارا نفع ان کے اکاؤنٹ

میں جمع ہو کر اُن کے توشہ آخرت کو بڑھا رہا ہوگا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ جو خیر کثیر مولانا نے عمر بھر تقسیم کیا وہ خیر کثیر آج اگر ایک طرف ان کے لیے بلندی درجات کا باعث ہے تو دوسری طرف ہزاروں لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بھی ہے۔

ان کے اعزاز اور یاد میں یہ پُر رونق اور روح پرور تقریب اور اس میں کثیر تعداد میں علماء کرام، حفاظ ،قراء ان کے تلامذہ اور قرب و جوار سے آئے ہوئے ان کے عقیدت مندوں اور عوام علاقہ کی موجودگی میرے اس دعوے کی سب سے بڑی دلیل اور مولانا سے عقیدتوں کا اظہار ہے، یہاں جب ان کی بلندی درجات کے لیے سب دعا گو ہیں وہاں ہر ایک خود سے یہ عہد بھی کرے کہ ان کی زندگی کے وہ روشن پہلو جن پر وہ عمر بھر قائم و دائم رہے ان کو اپنی زندگیوں میں لائے۔ دین سے محبت اور اشاعت کا جو پرچار وہ عمر بھر کرتے رہے سب اس راستے کو اختیار کرے اور جن برائیوں سے عمر بھر ان کو نفرت رہی ان سب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی زندگیوں سے دور کر دے۔

جس خدمت خلق کو عملاً انھوں نے کر کے دکھایا اس کو اپنی بقیہ زندگی میں نافذ کر کے دکھائے، صرف عبادت و ریاضت ہی نہیں بلکہ باقی معاملات، معیشت، معاشرت میں اللہ اور اس کے رسول ؐ کی سچی اتباع کرے۔ زندگی کے ہر ایک لمحے کو اپنے لیے عزیز از جان بنائے اور خالق کی فرمانبرداری میں گزارے اور خود کو خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرمانبرداری سے بچائے۔ صلہ رحمی اور خوش خلقی کو زندگی کا اہم اصول قرار دے۔ میں نے ان کی زندگی کو جتنا دیکھا، جتنا سمجھا، اور ان کے ہم عصر احباب سے مجھ تک جتنا کچھ پہنچا وہ سب یہی تھا جو میں نے آپ کے سامنے رکھا۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ مولانا عبدالرؤف کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ ان کا صدقہ جاریہ قبول فرمائے، ان کی دین کے لیے خدمات کو شرف قبولیت بخشے اور سب کو اپنی زندگیاں اپنی رضا کے مطابق گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

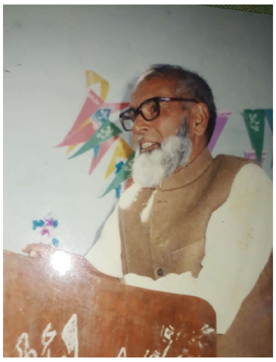

حیات سلیم

وقت ایک قوت ہے اور عمر ایک مہلت ، قوت صرف کرنے سے بڑھتی ہے۔اس کا ذخیرہ نہیں ہوتا نہ ہی اس کو ذخیرہ کیا جا سکتا ہے ۔مطلب جو بچ گئی وہ ضائع ہوگئی۔عمر کا بھی یہی حال ہے متواتر عمل پیہم سے زندگی دراز سے دراز ہوتی چلی جاتی ہے۔ بے عمل کی عمر اگر سو برس بھی ہوتو گویا پل بھر کو جیا......

سردار محمد سلیم خان بھی ان خوش قسمت ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے وقت کی قوت اور عمر کی مہلت کا بھر پور استعمال کیا جس کا اعتراف جناب اکرام الحق نے ان الفاظ میں کیا ہے ’’وہ مرنے سے پہلے جی بھر کر جیئے ، وہ زندگی کی حراست میں کبھی نہیں رہے بلکہ زندگی کو اپنے مضبوط حصار میں رکھا اور حوادث زمانہ کا مقابلہ کرتے ہوئے حالات کا رخ موڑتے رہے۔‘‘

آج اگر چہ سردار محمد سلیم خان جسمانی اعتبار سے ہمارے درمیان موجود نہیں اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ ادھر ہیں ہمارے آس پاس ہیں۔ان کی شخصیت اور حیات وخدمات لگ بھگ ایک صدی سے کچھ کم عرصہ حیات پر محیط ہیں۔یہ خدمات نہ صرف اس خطہ بلکہ ریاست بھر کے طول وعرض پر پھیلی ہوئی ان کے ہزاروں تلامذہ کی صورت میں پکار پکار کر ان کی خدمات کا اعتراف کر رہی ہیں۔

شاعری کے حوالے سے عموماً ایک بات کہی جاتی ہے کہ جس طرح کسی شعر کے دو مصرعے اگر ہم وزن نہ ہوں تو اچھا خاصا شعر بھی طبعیت پر گراں گزرتا ہے اسی طرح کسی شخص کی سوانح عمری مرتب کرتے ہوئے سوانحی خاکے میں شوخ رنگوں کی ذرا سی زیادتی یا گلکاری سے شخصیت کے اصل خدوخال دب جاتے ہیں اور قاری کے سامنے بشر کی بجائے کسی دیو مالائی ہیرو یا ایلین کی تصویر ابھرتی ہے جو انسان کم اور فرشتہ زیادہ دکھائی دیتی ہے۔اس کے برعکس خاکہ نگار اگر خاکے میں رنگ بھرتے ہوئے کسی بھی طرح کی کم آمیزی کا شکار

ہو جائے تو وہ خدوخال اتنے غیر واضح ہو جاتے ہیں جو شخصیت کے عکس کو نمایاں نہیں ہونے دیتے۔

حیات سلیم کو دیکھتے ہوئے کسی مافوق الفطرت ہیرو کا تصور ذہن میں جاگزیں نہیں ہوتا بلکہ ایک عام گوشت پوست کا انسان جو چاہے وطن کی سرحد پر دفاع وطن کی خدمت سرانجام دے رہا ہو چاہے درس و تدریس میں مشغول دکھائی دے رہا ہو، چاہے انتظامی ذمہ داریوں میں صدر معلم،، ڈائریکٹر سپورٹس، کنٹرولر امتحانات یا ڈائریکٹر سکولز کی ذمہ داریوں سے عہدہ برہ ہو رہا ہو یا پھر نجی زندگی میں بیٹا، بھائی، شوہر، باپ، دوست، رفیق جہاں جہاں بھی کارزار حیات میں برسر پیکار دکھائی دیتے ہیں اپنے حصے کا کردار بطریق احسن ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ان کی شخصیت کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ عام لوگوں میں عام رہتے ہوئے خاص تھے۔ جس کا اعتراف ان سے ملنے والا، ان کو برتنے والا اور ان کے ساتھ کام کرنے والا ہر ایک کرتا دکھائی دیتا ہے۔

میں کہیں آتے جاتے جب بھی کسی سلجھے ہوئے خوش حال اور خوش پوش نوجوان کو دیکھتا ہوں تو یقین ہو جاتا ہے کہ ضرور اس کا باپ کوئی صالح اور باعمل آدمی ہو گا کیونکہ فرمان باری تعالیٰ ہے وَ کَانَ ابُوْھُمَا صَالِحا...... باپ اگر نیک ہو با کردار ہو اور کسی نظم و نسق کا پابند ہو تو اس کا فائدہ اس کی اولاد کو پہنچتا ہے۔ میں جب بھی سردار محمد سلیم خان کو اور ان کے گھرانے کو دیکھتا ہوں ان کی اولاد کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ یقین اور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ سردار محمد سلیم خان کے والد نے اپنی زندگی میں اپنے عمل کا جو بیج بویا اس کا پھل سردار محمد سلیم خان کی صورت میں اور پھر آگے سلیم صاحب کو ان کی اولاد کی صورت میں دنیا میں ہی مل گیا۔

کہنے کو بہت کچھ ہے سردار محمد سلیم خان کے بارے میں بھی اور ان کے والد سردار محمد شیر خان کے بارے میں بھی کہ آج سے سو سال پہلے ذرائع رسل و رسائل نہ ہونے کے باوجود سینکڑوں کلومیٹر دور سکول و کالج میں پیدل تمام تر صعوبتوں کے باوجود اپنے بیٹے کو بھیج کر زیور تعلیم سے آراستہ کرنا اس کی تربیت کرنا کہ جس کا آج سو سال بعد بھی تصور ممکن نہیں کتنا جان جوکھوں کا کام تھا جسے انھوں نے ممکن کر دکھایا۔

باغ سے پونچھ شہر کا زمینی سفر آج کے جدید ذرائع آمدورفت کے باوجود سو کلومیٹر کے لگ بھگ بنتا ہے۔ یہ فاصلہ آج سے سو سال قبل ذرائع رسل و رسائل اور آمدورفت کی عدم دستیابی کے دور میں سارے کا سارا پیدل ہی طے کرنا پڑتا تھا۔سردار محمد شیر خان ایک صدی قبل کے منظر نامے میں اپنے بچے کی تعلیم کے بارے میں

کتنے بالغ نظر تھے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد میٹرک کی تعلیم کے لیے اپنے آبائی علاقے سے اتنے دور فاصلے پر اپنے لختِ جگر کو داخل کروایا۔اس کی آمدورفت کے لیے باقاعدہ پیادے کا انتظام کیا،اس سارے کام کی خود نگرانی کی اور اپنے بیٹے کی میٹرک مکمل کروائی اور اگلے مرحلے میں بلا تاخیر مزید تعلیم کے لیے سینکڑوں کلومیٹر دور ایس پی کالج سری نگر میں داخل کروادیا۔آج اگر کوئی شخص دنیا کے کسی بھی خطے میں جا کر تعلیم حاصل کرتا ہے تو یہ اس لیے بھی کوئی انوکھی بات نہیں کہ آج کے جدید ذرائع آمدورفت نے فاصلوں کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے اور کوئی بھی شخص دور ہوتے ہوئے بھی گھر سے دور نہیں ہے ۔اس کے برعکس وہ دور کہ جب ذرائع مواصلات کی عدم دستیابی کے سبب گھر سے چند گز دور ہونے پر بھی گھر والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی تھی اس طرح کا کوئی فیصلہ کر کے اس پر عمل درآمد کرانا کتنا مشکل اور محنت طلب کام تھا جو ممکن کر کے دکھایا گیا۔

ان حالات میں تعلیم کا حصول اور اس کے بعد برصغیر کے بدلتے ہوئے حالات میں جب کے اس نوازائیدہ خطے آزادکشمیر جس کے پاس انتظام امور ریاست کے لیے تربیت یافتہ افرادی قوت ہی دستیاب نہیں انتظامی مشینری کا حصہ بن کر اپنے حصے کا کردار ادا کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا سردار محمد سلیم خان نے اول تو فوج کو اپنی پہلی محبت کے طور پر چنا۔ابھی ملازمت شروع کیے ہوئے چند سال بھی نہیں گزرے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور سارے گھر کی ذمہ داری ان کے ناتوں کاندھوں پر آن پڑی۔ان حالات میں فوج کی ملازمت کو جاری رکھنا اور وہ بھی گھر سے بہت دور جا کر ملازمت کرنا ان کے لے لیے ممکن نہیں تھا لہذا پہلی محبت کو داغ مفارقت دے کر پیشہ تدریس کو دوسری محبت کے طور پر چنا جو آخر تک قائم ودائم رہی۔

ناتجربہ کاری کے باوجود جس احسن طریقے سے انھوں نے اپنی ملازمت کی ذمہ اریوں کو قبول کیا اور تفویض کردہ ہر فرض کو پورا کر کے دکھایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔آزادکشمیر کے قیام کے بعد ابتدائی تین سے چار عشرے اس اعتبار سے آمدورفت کے لیے کٹھن اور دشوار تھے کیونکہ اس نوزائیدہ خطہ میں تعمیر وترقی اور شاہرات کا ڈھانچہ ابھی ابتدائی شکل میں تھا۔اس لیے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ایک ملازم کی حیثیت سے گھر سے دور جائے تعیناتیوں پر جا کر اپنی پیشہ ورانہ خدمات سرانجام دینا وہ محنت اور مشقت طلب کام تھا جسے بلاشبہ وہ لوگ ہی سرانجام دے سکتے تھے جو ان حالات میں موجود تھے۔

سردار سلیم خان نے سب سے پہلے جن اصولوں اور نظم وضبط کو اپنی زندگی پر نافذ کیا اس کے بعد دوسروں سے اس کی پابندی کرائی۔ وہ جب گھر سے دور تھے تب بھی ان ڈیوٹی اسٹیشنوں پر قیام کر کے پیشہ وارانہ فرائض سرانجام دیے اور جب کسی حد تک قریب آئے تب بھی روزانہ میلوں کا پیدل سفر طے کر کے بروقت اپنی حاضری کو یقینی بنایا اور اس معاملے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ ان کی اس محنت اور لگن کے وہ تمام لوگ شاہد ہیں جو ان کی تعیناتیوں کے دوران اُن کے پیشہ وارانہ رفیق تھے یا جو ان کے ہم عصر رہے۔ دوران ڈیوٹی ادارے کے نظم ونسق پر کسی طرح کا کبھی سمجھوتا نہیں کرتے تھے سب سے پہلے خود نظم کی پابندی کرتے پھر اپنے ماتحتوں سے پابندی کراتے۔ وہ بہت کم زبان سے کچھ کہا کرتے، بس ان کی شخصیت اور رعب داب کا یہ عالم تھا کہ کسی ماتحت کو کبھی ان سے انحراف کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔

پروفیسر شفیق راجا اپنی سکول سروس میں استاد کی حیثیت سے لمبے عرصہ تک ان کے ماتحت رہے۔ ان کے بقول:

''ہماری سلیم صاحب کے ساتھ رفاقت کا دورانیہ ہائی سکول ریڑہ اور ہائی سکول ملوٹ رہا۔ دونوں اداروں میں تعیناتی کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کبھی سکول تاخیر سے پہنچے ہوں۔ حالانکہ ریڑہ سکول کا فاصلہ گیارہ کلومیٹر اور ملوٹ کا سولہ کلومیٹر بنتا تھا جسے ہم نے پیدل طے کرنا ہوتا تھا اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے یہ فاصلہ طے کر کے وقت سے پہلے سکول میں موجود ہوتے۔ ان کی اس لگن کو دیکھتے ہوئے کسی ماتحت سٹاف ممبر کو یہ جرات نہیں ہوتی تھی کہ وہ کبھی کسی وجہ سے تاخیر سے ادارے میں پہنچے۔ ان کی سروس کا زیادہ تر حصہ انتظامی سربراہ کی حیثیت سے رہا۔ اس سارے عرصہ میں انھوں نے کبھی اپنے کسی ماتحت کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی۔ انھوں نے قول کے مقابلے میں کردار کے اظہار کا ایسا نمونہ مقرر کر رکھا تھا جس کی وجہ سے قانون شکنی کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ اپنی ساری سروس میں کسی ماتحت ممبر کی اے سی آر خراب نہیں کی نہ کسی کے خلاف ایسی کوئی قانونی کارروائی کی جس کا اثر اس کی سروس فائل اور ریکارڈ پر پڑا ہو۔

سکول کے دورانیے میں ہماری ساری توجہ صرف اور صرف تدریس تک محدود ہوتی۔ سکول ٹائم کے بعد گھر سے ادارہ دور ہونے کے سبب ہمیں وہیں رہنا پڑتا تھا جہاں ہم ایک ساتھ رہتے، کبھی کھیلوں میں حصہ

لے لیتے ،کبھی کسی نئے مقام کی سیر کے لیے کمر باندھ کر نکل کھڑے ہوتے اور کبھی تاش کے پتوں کو پھینٹ رہے ہوتے ۔ جیسے ہی نماز کا وقت ہوتا تاش وہیں پھینک کر سب نماز میں کھڑے ہوجاتے ۔ایک موذن کا کردارادا کرتا،ایک اقامت کہتااورایک امام بن کرنماز کی ادائیگی کرواتا۔نمازختم ہوتی تو پھر وہیں سے سلسلہ شروع ہوجاتا۔

ایک مرتبہ سلیم صاحب چھٹی کے بعد گھر چلے گئے اور ہم وہیں ہاسٹل میں رہ گئے ۔کھانے کے وقت ہم کھانے والے زیادہ تھے اور پکانے والا ایک ہی باورچی ، وہ جیسے ہی توے سے گرم چپاتی اتار کرٹوکری میں ڈالتا ہم میں سے کوئی ایک اسے اُٹھالیتا اور باقی دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جاتے ۔ایک روٹی میں نے اُٹھائی تو ایک استاد نے اس پر مجھے گالی دے دی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر کھانے کے دوران میں نے کوئی ردعمل دینے کی بجائے کھانے پرتوجہ مرکوز رکھی۔ جیسے ہی کھانا ختم کیا میں نے ہاتھ بڑھا کر میز کے اُوپر سے دوسری طرف بیٹھے ہوئے اس استاد کوسر کے بالوں سے پکڑا اور پوچھا اب بتاؤ کیا گالی دی تھی۔اس پر اس نے ایک اور گالی دی تو میں نے اس کی بہت پٹائی کر دی۔

اگلے دن سلیم صاحب واپس سکول حاضر ہوئے تو کسی نے ہماری اس لڑائی کی خبر ان کو دے دی۔ سلیم صاحب نے ہم دونوں کی تنخواہ بند کروادی اس کے علاوہ ہم سے کوئی بات نہیں کی۔دو ہفتوں کے بعد مجھے ایک دن دفتر میں بلایا اور کہنے لگے گلٹھی خان تمھیں پتہ ہے میں نے تمھاری تنخواہ کی بندش کی چٹھی کیوں لکھی؟ اس لیے کہ تم نے اس'' جنگِ پھُلکا'' میں استاد ہوتے ہوئے دوسرے استاد کے ساتھ جھگڑا کیا جو تمھارے شایانِ شان نہیں تھا۔اگرتم نے گالی کھانے کے بعد اس سے مار بھی کھائی ہوتی تو تمھاری تنخواہ کبھی واگزار نہ کرتا مگرتم نے جو کیا وہ چونکہ ردعمل میں درست تھا اس لیے تنخواہ دوبارہ بحال کرتا ہوں البتہ آئندہ اس طرح کی حرکتوں سے باز رہیں۔''

بقول اکرام الحق: قدرت نے جس فشار سے ان میں علم بھرا تھا وہ اسی شدت سے اسے منتقل کرنے میں عمر بھر کوشاں رہے۔جس ڈسپلن کوانھوں نے اپنے جثّے پر نافذ کر رکھا تھا وہ چاہتے تھے کہ اسی طرح ساری قوم بھی نظم وضبط کی پابند ہوجائے۔ وہ وسیع القلب، وسیع النظر، سریع الرفتار،لطیفہ سنج اور وضع دار تھے۔اپنے

دفتر میں عموماً بسمارک، دوستوں میں مشتاق یوسفی اور گھر میں تحریک نظام مصطفیٰ کے سب سے بڑے داعی تھے۔ایسی خصوصیات کے حامل شخص کی شخصیت کس طرح کی ہوسکتی ہے اور کلیدی عہدوں پر ذمہ داریوں سے عہدہ براہونے کے لیے وہ کس طرح کا ہوسکتا ہے یہ ہم میں سے ہرایک اندازہ کرسکتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ صدر معلم کے عہدے پر تعینات تھے تو تب بھی اپنے فرائض منصبی پر پوری طرح توجہ مرکوز کیے ہوئے اور ڈائریکٹر سپورٹس، کنٹرولر امتحانات اور ڈائریکٹر تعلیم کے عہدوں پر بھی اپنے پیشہ وارانہ فرائض سے پوری طرح عہدہ برا ہونے کی صلاحیتوں سے لیس آخر وقت تک اسی لگن اور جذبے سے اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔یہ ان کی اپنے کام اور پیشے سے لگن ہی تھی جس نے انہیں ہمیشہ ممتاز مقام عطا کیا۔ان کی خوش قسمتی یہ رہی کہ قیام پاکستان سے قبل ان کو ہائی سکول پونچھ اور ایس پی کالج سری نگر جیسے اداروں سے تعلیم وتربیت کے مواقع میسر رہے جنھوں نے ان کی صلاحیتوں کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔

ایس پی کالج سری نگر میں ایک ایسے وقت میں آپ کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا جب برصغیر میں بیداری کی تحریک اپنے پورے زوروں پر تھی اور عموماً کالجز ہی ان سرگرمیوں کا محور ومرکز سمجھے جاتے تھے۔یوں سردار محمد سلیم خان بھی طلبہ سیاست کا حصہ بن کر پیش پیش رہے۔یہ الگ بات کہ تقسیم برصغیر کے ہنگاموں میں جب حالات زیادہ خراب ہونا شروع ہوئے اور ڈوگرہ سرکار کی طرف سے تحریک کو کچلنے کے لیے بلا جواز گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کے والد نے ان کو فوراً سری نگر سے گھر بلا لیا۔جبکہ باغ میں ان سیاسی سرگرمیوں کے پیش نظر ان کے والد محمد شیر خان کئی بار گرفتار ہوئے اور کئی سال تک قید وبند کی صعوبتوں سے پونچھ، سری نگر اور جموں جیلوں میں پابند سلاسل رہے۔

لگ بھگ چالیس سالہ پیشہ ورانہ خدمات کے آخر پر پیرانہ سالی کے باعث ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اسی جذبے اور لگن کے ساتھ سماجی سطح پر بھی پیش پیش رہے۔عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب ہم ملازمت میں ہوتے ہیں تو عام آدمی کو منہ تک نہیں لگاتے اور جب ملازمت سے سبکدوش ہوکر واپس عوام میں آتے ہیں تو پھر عوام بھی وہ پذیرائی نہیں دیتی جس کی ہم توقع کررہے ہوتے ہیں۔سلیم صاحب اس معاملہ میں خوش نصیب تھے کہ ان کا رویہ دوران ملازمت بھی عام لوگوں کے ساتھ ویسا ہی تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ

اسی رویے کے ساتھ زندہ رہے۔یہی وجہ ہے کہ انہیں معاشرتی سطح پر اس عدم قبولیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس کا ان آفیسران کو کرنا پڑتا ہے جو دوران ملازمت زمین پر دیکھتے تک نہیں۔

سروس کی تکمیل کے بعد ان کا اگلے تین عشروں سے زائد کا سفر باغ میں ہی گزر، اپنے اہل وعیال کے درمیان، اپنے اقرباء کے درمیان اور اپنے یاران خوش خرام کے درمیان۔ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا جب تک وہ صحت کی بہترین حالت میں رہے تب تک تو باقاعدگی سے سماجی زندگی کے گہما گہمیوں کا حصہ رہے۔ایک دوسرے کے پاس آنا، خوشی غمی کے مواقع پر باقاعدگی سے معاشرتی اجتماعات میں شرکت کرنا ان کا معمول رہا۔البتہ بعدازاں پیرانہ سالی اور جسمانی کمزوری کی وجہ سے کافی حد تک یہ آمدورفت کم ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ خاص مواقع پر ہی اپنی اولادوں میں سے کسی کے ساتھ شرکت کرنے اور نماز جمعہ اور عیدین کی باقاعدہ حاضری تک محدود ہوتی چلی گئی۔

ان کا معمول تھا کہ جمعہ کو لازماً باغ آتے۔اصغر بانڈے کی دکان پر بیٹھتے،اصغر بانڈے بھی اس معاملے میں کمال آدمی تھا کاروبار تو اس کا کپڑے کا تھا اور چہرے مہرے سے بھی کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا مگر اس میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ بہت سے افسران بلاناغہ اس کے پاس آ کر گھنٹوں بیٹھتے، ہنسی مذاق کرتے، تبادلہ خیال ہوتا۔ان بیٹھنے والوں میں وہ بھی تھے جو ابھی سروس میں تھے اور وہ بھی جو سروس کے جھنجھٹ کو سر سے اتار کر اب فارغ البالی سے اس کے پاس آ بیٹھتے۔ فارغ البال ان افسران کی بھی اپنی ہی دنیا اور اپنا ہی کنبہ تھا جو یہاں جمع ہوتا۔ یہ سارے وہ لوگ تھے جو زیادہ تر جمعہ کو ہی باغ شہر میں آتے اور یہاں بیٹھنے، ایک دوسرے کے ساتھ گپ شپ کرنے، چائے کلچہ کھانے کے بعد نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد واپس اپنے گھروں کو لوٹتے۔ان کی خوشیوں اور تنہائیوں کو بانٹنے والے زیادہ تر یہی لمحات ہوتے جو وہ یہاں گزار کر گھروں کو جاتے۔ایک جمعہ سے اگلے جمعہ تک کی خوشیوں کا سارا ذخیرہ کرتے اور پھر اگلے جمعہ کو دوبارہ ملنے کی آس میں اپنے گھروں کے ہو رہتے۔

میں نے جامع مسجد کا بھی عجب منظر دیکھا ہے اور یہ منظر گزشتہ لگ بھگ تین عشروں سے تسلسل سے دیکھ رہا ہوں۔مسجد کی پہلی صف عموماً ان نمازیوں پر مشتمل دکھائی دیتی ہے جو کار محنت اور کار ملازمت سے گزر کر

اب کار فرصت تک آن پہنچے ہیں۔ یہ وہ نمازی ہیں جو جمعہ کے دن بالکل اول وقت میں آ کر صف سنبھالتے اور پھر وہیں اپنے معمولات میں مصروف ہو کر جمعہ کی ادائیگی تک مقیم رہتے اور پھر نماز کے بعد ایک دوسرے سے ملتے ملاتے اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو جاتے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی ایک بزرگ اچانک ان میں سے کم ہو جاتا ہے۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیمار ہو گیا ہے یا پھر دنیا سے رخصت ہو گیا ہے پھر ایک اور اور یوں کرتے کرتے اب خال خال ہی وہ نمازی پہلی صف میں دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے جدت آ جانے کے بعد ان مسجد کی صف کی بجائے مسجد کی دائیں یا بائیں دیوار کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی ان کرسیوں پر ایک ایک کر کے ان نمازیوں کا براجمان ہونا جو نیچے نہیں بیٹھ سکتے اور پھر ان کا بھی یوں چلنے جانا جیسے یہ بھی اپنا کردار ادا کرنے آئے تھے اور کردار ادا کر کے اسی خاموشی کے ساتھ رخصت ہو گئے۔

زندہ دلی کا جو وصف سلیم صاحب میں اولین دور سے تھا وہ آخر وقت تک برقرار رہا۔ البتہ اولادوں کی ایک ایک کر کے شادیوں اور بعد ازاں ان سب کا کارِ سرکار کے باعث اپنی فیملیوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے سبب کسی حد تک تنہائی کا ضرور شکار ہوئے۔ یہ تنہائی اس وقت اور زیادہ بڑھ گئی جب ان کی نصف بہتر دنیا میں نہ رہی۔ وہ اس حوالے سے بہت خوش قسمت رہے کہ انھوں نے کبھی کسی پریشانی یا غم کو اس طرح سے خود پر طاری نہیں کیا جو ان کی روزمرہ زندگی پر اثر انداز ہوتا۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ بھرپور طریقے سے گزارا اور زندگی کی حراست میں رہنے کی بجائے اسے اپنی حراست میں رکھا۔ جس ولولے کے ساتھ زندہ رہے اسی خوش دلی اور ولولے سے معین وقت میں موت کو گلے لگا لیا۔

☆☆☆

ضمیر باضمیر

قانون فطرت ہے جو اس دنیا میں آتا ہے اُس نے ایک دن اس فانی دنیا سے رخصت ہونا ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ ازل سے چلا آرہا ہے اور تا ابدیوں ہی جاری وساری رہے گا۔ مگر جانے کیوں کچھ انسانوں کا ہمیں یوں چھوڑ کر چلے جانا محض سوگوار ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے پیچھے ایک ایسا خلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ کم ہی نہیں ہوتا۔ ویسے بھی ہم اب بحثیت قوم جس عہد نا اعتبار سے گزر رہے ہیں وہاں ایک ایسا قحط الرجال برپا ہے کہ آدمی تو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا وہ بھی سید ضمیر گردیزی جیسا..........

کہنے کو سید ضمیر گردیزی ایک عام سے دبلے پتلے عام قد وقامت مگر چہرے پر وہ رعب اور وقار لیے ہوئے کہ ملنے والا پہلی ہی ملاقات میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ پاکستان کی وہ سیاسی جماعت جو قائم ہوئی تو ایک ہی دن میں ملک کے چپے چپے پر اُس کے ساتھ وابستہ ہونے والوں کی سب سے زیادہ تعداد تھی وہ پاکستان پیپلز پارٹی تھی۔ سید ضمیر گردیزی کا پہلا عشق پاکستان پیپلز پارٹی بنا اور ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھا کہ مصداق وہی آخری عشق بھی رہا۔ پارٹی سے اس وابستگی کے ساتھ انہوں نے اپنی زندگی کی نصف صدی بیتا دی مگر چاہت تھی کہ کم نہ ہوسکی۔

ہمارے ہاں رواج ہے کہ لوگ انتخابات قریب آتے ہی امکانی طور پر اقتدار میں آنے والی جماعت کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں اگلے پانچ سال سارے مفادات سمیٹ کر اگلے الیکشن سے پہلے نئے محبوب کی تلاش میں سرگرداں نئی محبت کا ورد کرتے اگلے انتخابات تک نئی جماعت کے سپرد ہو جاتے ہیں۔ بدلتے ہوئے دنیا کے منظر نامے میں اب تو صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ ایک ہی گھر کے تمام افراد الگ الگ جماعتوں کے ساتھ منسلک ہو کر عملی سیاست کا حصہ بنتے ہیں تا کہ حکومت جس سیاسی جماعت کی بھی بنے اس کے مفادات اس فرد کی نسبت گھر کے سب افراد تک پہنچ سکیں مگر آفرین ہے کہ اس مرد درویش نے پچھلے پانچ

عشروں میں ایک بار بھی جماعتی وابستگی نہیں بدلی۔

رہی بات مفادات کی تو میں نے اُن کو بڑا قریب سے دیکھا اور ہر بار یہی پایا کہ ان کو مفادات سمیٹنا آتا ہی نہیں تھا۔ تبھی تو جب گھر بار تقسیم ہوا تو سب کچھ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں میں ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق تقسیم کر دیا اور اپنے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا جو آج بھی کسی حوالے سے رہنے کے لیے موزوں ہی نہیں۔ پیپلز سیکرٹریٹ کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو ایک بار نہیں کئی بار وزیر حکومت رہنے والے سردار قمر الزمان خان کے ساتھ سیاہ وسفید کے مالک اور اختیارات رکھنے کے باوجود نہ کبھی کوئی عہدہ لیا نہ ایک روپیہ خود پر خرچ کیا۔

سید ضمیر گردیزی درمیانہ قد اور متوسط جسم کے مالک تھے چہرہ ہمیشہ تازہ شیو کیا ہوا، سر پر تازہ تیل لگے چمکدار بال جو وقت کے ساتھ اگرچہ کم ہو گئے تھے مگر پھر بھی اتنے تھے کہ سر کو وجیہہ بناتے۔ آنکھوں پر ہمیشہ عینک سجائے اکثر چمکدار استری شدہ سفید لباس اور سیاہ واسکٹ میں ملبوس ہر ایک کے لیے چہرے پر تبسم لیے حاضر رہتے۔ جوانی کی دہلیز پر خاندان میں ہی رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے مگر زیادہ عرصہ تک نبھا نہیں ہو سکا ، بعد ازاں خاندان سے ہٹ کر شادی ہوئی جو آخری سانس تک قائم رہی۔ اس شادی سے اُن کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

ایک بار ملاقات میں کہنے لگے کہ مجھے سردار قمر الزمان صاحب نے اپنے دستخط کا اختیار دے رکھا تھا کہ جو بھی ضرورت مند آپ کے پاس پیپلز سیکرٹریٹ میں آئے اس کی ہر ضرورت کو آپ پورا کریں۔ میری طرف سے آپ کو میری زمین اور میری بیوی کے طلاق کے علاوہ ہر چیز پر دستخط کرنے کا اختیار ہے۔ اس سارے اختیار کے باوجود سید ضمیر گردیزی نے دوسروں کے لیے تو ایک چھتنار کا کام کیا مگر اپنی اور اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی نہیں جوڑا۔ دن بھر پیپلز سیکرٹریٹ میں آنے والے سینکڑوں ضرورت مند اپنی درخواستوں پر عملدرآمد کروا کر جاتے اپنے کام مکمل کروا کر دعائیں دیتے رخصت ہوتے مگر اپنے لیے وہی درویشی، پیدل صبح گھر سے آنا، راستے میں سب سے ملنا، بیمار پرسی کرنا، دوسروں کی ضروریات کی تکمیل کرنا اور شام کو اسی طرح واپس چلے جانا۔

عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں عروہ بن محمد کو یمن کا گورنر تعینات کیا گیا، لوگ استقبال کرنے کے لیے شہر سے باہر آئے تو انھوں نے بس اتنا سا خطاب کیا الوگو!'' دیکھو یہ میری سواری ہے اس کے اوپر میرا مصحف اور ایک عدد تلوار ہے اور یہ میرا کل اثاثہ ہے۔ مدت گورنری ختم ہونے کے بعد اگر واپس جاتے ہوئے اس کے علاوہ کچھ پایا تو مجھے چور سمجھ لینا''۔ پورے بیس سال بعد جب لوگ اسے بھیگی آنکھوں رخصت کرنے آئے تو اس کا کل اثاثہ وہی ایک اونٹ، تلوار اور مصحف تھا۔ ایسے لوگ خال خال ہی پیدا ہوتے ہیں۔

سید ضمیر گردیزی بھی اسی روش پر قائم رہے ایک محافظ، ایک نگران، پیپلز پارٹی، پیپلز سیکرٹریٹ، پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن، عوام الناس سب کے ساتھ یکساں روش رکھی۔ اپنے لیے کوئی ایسا توشہ جمع نہیں کیا جو ان کے جانے کے بعد ان کے لیے بوجھ ہوتا۔ عہد حاضر میں ہمارا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ قحط الرجال کے اس عالم میں ہم ایک ایک کر کے ایسی شخصیات کے سائے سے محروم ہو رہے ہیں جو دلِ بینا بھی رکھتے تھے اور دردِ دل بھی۔ جنہوں نے مسلکی، قبیلائی، لسانی غرض ہر طرح کے تعصّبات سے بالاتر رہتے ہوئے سب کے ساتھ یکساں بھلائی کو اپنائے رکھا ہو۔

کہتے ہیں بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جس کی محفل میں کوئی خود کو چھوٹا اور کمتر نہ سمجھے اور بڑا آدمی وہ ہوتا ہے کہ ہر کوئی اس کو اپنے دکھوں کا مداوا سمجھے۔ سید ضمیر گردیزی کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے چھوٹے بڑے سب کو یکساں عزت دی، محبت کا برتاؤ کیا اور دکھ سکھ میں ہمیشہ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ گاؤں یا شہر کی سطح پر جب بھی کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوا سید ضمیر گردیزی نے ساری مصروفیات ترک کر کے اس کو حل کرنے کی تگ و دو کی اور اسے حل کر کے دم لیا۔

بہن بھائیوں میں وہ سب سے بڑے تھے اپنے عمل سے اُنہوں نے اس بڑے ہونے کا حق ادا کر کے دکھایا۔ الیکشن کا موسم آتا تو تمام جماعتوں کے نمائندوں کو اپنے پاس بلاتے اُنہیں امن و ہم آہنگی کی تلقین کرتے۔ انتخابات سے ایک دن قبل تمام پارٹیوں کے پولنگ ایجنٹوں کو اکٹھا کر کے کہتے کہ الیکشن ایک دن ہوتا ہے ہم نے تمام عمر ساتھ رہنا ہے۔ الیکشن کے ایک دن کے لیے اپنی اخلاقیات کو بالائے طاق مت رکھو۔ پرامن پولنگ کروانی ہے جو بھی جماعت جیتے گی ہم سب مل کر اسے مبارکباد دیں گے۔ عدم برداشت کی اس

فضا میں ایسی کوئی برداشت کی مثال بھلا ہو سکتی ہے؟

انہیں بناوٹ نہیں آتی تھی سیدھے کھرے اور حق بات کہنے والے، حق پر چلنے والے، بے باک انسان، ہمیشہ ایک چمک اُن کی آنکھوں میں رہتی۔ ایک ولولہ تازہ ہمیشہ ان کا رفیق اور ہم سفر رہتا جوان کے چہرے سے جھلکتا۔ دھوپ ہو یا بارش وقت مقررہ پر گھر سے روانہ ہونا، ایک اعزازی ذمہ داری کو فرض سمجھ کر نبھانا، پوری ڈیوٹی دینا بدلے میں ایک فیصد بھی کسی چیز کی توقع نہ رکھنا۔ بلا تنخواہ سالوں تک محض ایک نظریے کی خاطر پیپلز سیکرٹریٹ کو کھولنا، بند کرنا، مکمل ڈیوٹی دینا یہ کام سید ضمیر گردیزی کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

ناکافی وسائل کے باوجود مہمان نوازی کا وصف اس قدر تھا کہ جو کوئی اُن کے گھر گیا وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ دستر خوان کچھ اس طرح سے سجتا کہ مہمان کبھی یہ نہ کہہ سکتا کہ دستر خوان پر کسی چیز کی کمی ہے۔ اس کام میں اگر ان کی شریک حیات اور نصف بہتر (better half) کے کردار کو نہ سراہا جائے تو زیادتی ہوگی کیونکہ انہوں نے ان تمام صفات کو عملاً ممکن بنایا۔ ہمیشہ خندہ پیشانی سے سب کا استقبال کیا۔ بلاتفریق سب کی خدمت کی، سب کی مہمان نوازی کی اور دل و جان سے اپنے ہم سفر کی رفیق سفر ہیں۔

زندگی کے آخری چھ سات سال سید ضمیر گردیزی کے ضبط و برداشت کا مکمل امتحان لیے ان پر گزرے۔ ہمارے ہاں سرطان کا نام ہی جان لیوا ہے۔ یہ وہ ناسور ہے جو ایک دفعہ لگ جائے تو جان لے کر ہی چھوڑتا ہے۔ ان پانچ سالوں میں کتنے ہی مرد و زن کے بارے میں سنا، ان کی تیمارداری کا اتفاق ہوا۔ جو جوان تھے، صحت مند تھے، طاقتور و توانا تھے مگر جب وہ اس ناسور کا شکار ہوئے تو کوئی ہفتہ کوئی مہینہ تو کوئی سال کا مہمان رہا۔ خال خال ہی کوئی ہوا ہوگا جس نے اگلے دو تین سال تک کیموتھراپی اور ریڈیشن کے بعد کے حالات کا مقابلہ کیا ہو۔ سید ضمیر گردیزی ایک، دو، تین نہیں بلکہ سات سالوں تک ان تمام تر حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ اتنے لمبے عرصہ تک ہر ہفتے پانچ گھنٹوں سے زیادہ کی مسافت طے کر کے راولپنڈی جانا، اپنا علاج کروانا پھر واپس آنا۔ بڑے بڑوں اور صاحب ثروت حضرات کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ مگر آفرین ہے کبھی ان کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نظر آئی ہو، کوئی جذبہ ماند پڑا ہو، کوئی حرف شکایت زبان پر آیا ہو یا پھر کبھی بیماری کا کہا ہو۔

آخری ایک سال میں نقاہت اس حد تک بڑھ گئی کہ چلنے پھرنے سے رہ گئے پھر بھی جب کوئی ان کی تیمارداری کو جاتا تو اسی جذبے اور لگن سے ملتے۔ایک لمحے کو بھی یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ کوئی بڑا مسئلہ ہے۔ ہمیشہ یہی کہتے کہ میری ٹانگوں میں جان نہیں رہی ہے۔آج بھی ذرا جان آجائے تو میں ان سب کا مقابلہ کرسکتا ہوں۔روزانہ تازہ شیو بنانا،تروتازہ رہنا،صاف لباس پہننا بیماری میں بھی ترک نہ کیا۔کسی نے مشورہ دیا کہ اب آپ ڈاڑھی رکھ لیں تو کہنے لگے کہ نہیں لوگ سمجھیں گے ضمیر شاہ نے موت سے ڈر کر ڈاڑھی رکھ لی ہے۔ چہرے پر تروتازگی کی یہ روش آخری دن تک یوں ہی قائم ودائم رہی۔وفات سے ایک دن قبل چہرے پر کچھ نقاہت اور مایوسی کی کیفیت دیکھتے ہوئے شہباز گردیزی نے ان سے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ کوئی وجہ نہیں ۔زیادہ زور دیا تو اشارے سے شیو اور بال ڈائی کرنے کی بات کی۔یوں اُن کی شیو اور بال ڈائی کیے گئے اور وہ پھر سے تروتازہ اور مطمئن ہو گئے۔سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے تو سفید کفن میں لپٹا ہوا تروتازہ چہرہ دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ سید ضمیر گردیزی ابدی نیند سو گئے ہیں۔یہ لگتا تھا کہ

ابھی تو سوئے تھے مقتل کو سرخرو کر کے

ہم سید ضمیر گردیزی کو ہمیشہ سید شہباز گردیزی کے والد کی حیثیت سے ہی دیکھتے رہے۔ایک ایسے شاعر کے والد کی حیثیت سے جس کی پہچان ادبی حلقوں میں مسلمہ ہے۔عام خیال یہی تھا کہ کرونا کی وجہ سے اُن کے جنازے میں ان کے رفقاء،قریبی اعزا اور پارٹی کے چند لوگ ہوں گے باقی سب شرکاء جنازہ اور تعزیت پر آنیوالے سید شہباز گردیزی کی نسبت والے ہوں گے اور جنازہ بھی کرونا کے حالات میں جب کہ

ہر کوئی ہے یہاں پہ خطرے میں
اب سبھی کو سبھی سے خطرہ ہے

یہ وہ مشکل وقت تھا کہ گھر والے گھر والوں سے بھاگ رہے تھے ان حالات میں میں نے ایسے بھی جنازے دیکھے جہاں صرف پانچ، چھ لوگوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔تعزیت پر خال خال ہی کوئی آیا ہوگا، حال یہ تھا کہ بس سوشل میڈیا پر لوگوں نے ایموجیز لگا کر سوگواران کو تعزیتی پرسہ پیش کیا۔ایسے میں بغیر اعلان، بغیر کسی بڑی تشہیر کے جب جسدِ خاکی کو جنازہ گاہ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو سینکڑوں گاڑیوں کے جلوس میں

لوگ جنازہ کے ساتھ تھے۔ جنازہ گاہ میں ہزاروں سوگواران سیاسی زعماء انتظامی آفیسران، پارٹی کارکنان اور ہر طرف نئے نئے چہرے حاضر تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو سید ضمیر گردیزی کو خراج عقیدت پیش کرنے آئے تھے۔ کوئی قرب و جوار سے تو کوئی میلوں کی مسافت طے کر کے دور دور سے حاضر ہوا تھا۔

تعزیتی کلمات کہنے والوں نے جن کلمات کے ساتھ ان کی زندگی، ان کی خدمات اور ان کے کام پر ہدیہ تبریک پیش کیا اس کا لفظ لفظ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ شہباز گردیزی نے اپنے تعزیتی کلمات میں اپنی کم مائیگی کا اظہار کتنے خوب صورت الفاظ میں کیا کہ میں ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ لوگ میری نسبت سے میرے والد کو جانتے ہیں مگر آج کے اس جم غفیر اور عقیدت مندوں کو دیکھ کر میرا یہ زعم نکل گیا ہے کہ میں بھی کسی گنتی میں ہوں۔

کسی سیانے نے کیا خوب کہا ہے کہ ہم جس چہرے کو لے کر پیدا ہوتے ہیں وہ ہمارا اپنا نہیں ہوتا مگر ہم جس چہرے کے ساتھ مرتے ہیں وہ ہمارا اپنا ہوتا ہے۔ سات عشروں پر مشتمل اس سفر زندگی میں بلا شبہ سید ضمیر گردیزی نے بظاہر ایک عام آدمی کی حیثیت سے زندگی گزاری، بہت سے ممالک کی مسافت کی بہت سی انتظامی ذمہ داریوں اور روزگار سے وابستہ رہے جن میں سے ہر ایک پر بہت کچھ لکھنے کو باقی ہے مگر ہر ایک کام اور ذمہ داری کو جس احسن انداز سے نبھایا جس طرح "ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے" کو اللہ کا کنبہ سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا، ان کی خدمت کی ہمیشہ ہر کام میں پیش پیش رہے یہ کام ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ہمارے درمیان آج اگر چہ وہ موجود نہیں مگر جو چہرہ وہ چھوڑ کر گئے ہیں وہ قابل تعریف بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ اللہ رب العزت ان کی حسنات کو قبول فرما کر انہیں ابدی راحت نصیب فرمائے۔

☆☆☆

سائیں جی

باغ کا ایک ایسا روشن چہرہ جو اچانک باغ کے اُفق پر نمودار رہوا اپنی جولانیوں اور رنگارنگیوں سے باغ کے رنگوں میں اضافہ کیا اور پھر خاموشی سے ایک دن ان دیکھی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جی ہاں بات ہو رہی ہے آزاد کشمیر کے شہر ضلع باغ کی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ باغ تو واقعی باغ ہے برادریوں کے گلدستے کی وجہ سے ،مسلکی وقبیلائی رنگارنگی سے ، رنگ ونسل کی تفریق اور ذات پات کے برعکس اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کے حوالے سے ایک بہترین جگہ کے طور پر۔

باغ شہر سے ایک سڑک سیدھی باغ کے شمال کی طرف نکلتی ہے جو سیاحتی ومضافاتی مقام سدھن گلی و گنگا چوٹی کے دامن سے گزرتی صوبہ کشمیر کی حدود میں داخل ہوتی ہوئی چکار اور آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفرآباد اور کشمیر کے دارالحکومت سری نگر کو جاتی ہے۔اسی سڑک پر باغ سے ۸کلومیٹر کے فاصلے پر مرّنہ کے نام سے ایک قصبہ آباد ہے جہاں سے ایک اور سڑک گنگا چوٹی کی طرف نکلتی ہے۔اسی سدھن گلی اور گنگا چوٹی کو جانے والی سڑک کے سنگم پر وہ مقام جس کو سائیں جاوید سے پہلے شاید مقامی لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا اور جو سائیں جاوید کے آنے کے بعد اسی کے نام سے اس طرح مشہور ومعروف ہوا کہ آزاد کشمیر اور پاکستان کا شاید ہی کوئی علاقہ یا شہر ہو جہاں سے لوگ سائیں جاوید کے پاس نہ آئے ہوں اور جو باغ کو سائیں جاوید کے حوالے سے نہ جانتے ہوں۔

سائیں جاوید کہنے کو ایک عام سا درمیانے قد، سانولی رنگت ، ڈاڑھی سے بھرپور چہرے اور نیلی چمکدار آنکھیں، سر پر سفید عمامہ اور پاؤں میں عام طور پر سلیپر پہنے ہوئے وہ شخص تھا جس کے بارے میں شاید اس کے محلے کے لوگ بھی کم کم ہی جانتے تھے۔مگر جب اپنی خداداد صلاحیتوں اور درد دل کے ساتھ مخلوق خدا کی خدمت کے لیے وقف ہوا تو پھر کون ایسا تھا جو اس کو نہیں جانتا تھا۔گویا ہم میں سے ہر ایک جس چہرے کے

ساتھ پیدا ہوتا ہے وہ اس کا اپنا نہیں ہوتا مگر وہ جس چہرے کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتا ہے وہ چہرہ وہی ہوتا ہے جسے وہ انسان اپنی پچاس ساٹھ سالہ زندگی میں بناتے ،سجاتے اور لوگوں کے سامنے رکھتے ہوئے گزارتا ہے۔ ہماری پیدائش بیشک کوئی تاریخ یا تاریخی واقعہ نہیں ہوتی مگر ہماری موت بلاشبہ ایک تاریخ اور ایک تحریک ہوتی ہے۔سائیں جی عمر بھر اس قول کی عملی تفسیر رہے۔

ہمارے ہاں سندھ کے برعکس عموماً سائیں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو علائق دنیا سے نابلد ہو، جسے عام انسانوں کی طرح جینا نہ آتا ہو۔ جو عام انسانوں کے نزدیک ایسا نہ ہو جسے کسی خاطر میں لایا جاسکے۔تبھی تو ہم ہر اس شخص کو سائیں کے لقب سے ملقب کر دیتے ہیں جو ہمارے پیمانے پر پورا نہ اترتا ہو۔اس کے برعکس وہ شخص جاوید کہلاتا ہے جس کا ذکر زندہ و باقی رہنے والا ہو۔ممکن ہے سائیں جاوید کے بچپن لڑکپن کے ایسے واقعات اور ایسی عادات رہی ہوں جن کی وجہ سے وہ اپنے رہنے والوں کے درمیان سائیں کی تعریف پر پورا اترتا ہو تبھی وہ سائیں کہلایا۔مگر اس کی شخصیت میں ایسا کچھ ضرور تھا جو اس کے ذکر کو باقی رکھنے والا تھا۔

اس کو فطرت سے بہت محبت تھی۔شاید یہ اس کی وہی محبت تھی جو اسے بستیوں سے اُٹھا کر ویرانوں کی طرف لے گئی جہاں رہتے ہوئے اور فطرت کے ساتھ ہم کلام ہوتے ہوئے اسے فطرت شناسی ہوتی چلی گئی ۔یوں وہ جہاں فطرت سے محبت کرنے والا بنتا چلا گیا وہیں فطرت کے ساتھ رہتے ہوئے اسے ان چیزوں کی معرفت اور ہمکلامی بھی عطا ہوتی گئی جو آگے چل کر مختلف پودوں، جڑی بوٹیوں اور جنگلی حیات کے خواص کی شکل میں اس کے سامنے منکشف ہوتی گئی۔اس طرح سائیں جاوید، اگلی منزل یعنی حکیم جاوید کی طرف سفر کرتا چلا گیا۔یہی وہ خواص تھے جن کو کشید کر کے سائیں جاوید آنے والے سالوں میں مخلوق خدا کے لیے فائدے کا باعث بننے والا تھا۔

عام آدمی کا سب سے پہلا سوال یہ ہوتا تھا کہ سائیں جاوید کوئی پیر ہے جو دم درود کے ذریعے مریضوں کا علاج کرتا ہے، وہ کوئی حکیم ہے جو حکمت کی گھتیوں کو سلجھا کر آنے والے مریضوں کی بیماری کا تریاق کرتا ہے، وہ کوئی مجذوب ہے جو جذب و مستی کی کسی کیفیت کے اندر جا کر مخلوق خدا کے لیے فیض بانٹ رہا ہے، اس کے پاس ایسے کوئی موکلات ہیں جن کے ذریعے وہ مریضوں کی صحت یابی کی کوشش کرتا ہے ان کی

باقاعدہ روحانی سرجری کرتا ہے؟ اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے ایسے سوالات تھے جو آنے والوں کو سوچنے پر مجبور کرتے تا کہ وہ اپنے تائیں خود کو مطمئن کر سکیں۔مگر شاید میری طرح کسی کے پاس ان سوالوں کا جواب نہیں ہوتا تھا۔

اس کے پاس آنے والا ہر بیماری کا مریض جب اپنی حاجت بیان کرتا تو اس کے جواب میں وہ ایک کاغذ پر چند آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر کوئی نسخہ لکھتا اور مطب میں بھیج دیتا جہاں پہلے سے موجود چاک چوبند چند کڑیل قسم کے ان کے عملے کے لوگ کولڈ ڈرنکس کے لیے استعمال ہونے والی کسی بوتل میں قہوہ نما ایک مشروب بھر کر مریض کے حوالے کر دیتے۔ بیماری جو بھی ہے دوائی ایک ہی ہے جو دل کے مریضوں کے لیے بھی، گردے کے مریضوں کے لیے بھی۔کینسر کے مریض بھی اسی دوائی کو استعمال کرتے اور جگر اور مثانے کے مریض بھی اسی مشروب کو لے کر روانہ ہوتے۔ حیرت اس بات کی تھی کہ مختلف جڑی بوٹیوں کے عرقیات سے کشید کیا ہوا یہ مشروب ہر ایک مرض کے لیے تیر بہدف کا کردار ادا کرتا اور ہر مریض اپنی اپنی بیماری کے حساب سے صحت یاب ہوتا۔صحت یاب ہو کر یہی مریض اور اس کے لواحقین سائیں جاوید کی تشہیر اور سفارت کاری کا ذریعہ بنتے۔ یوں چراغ سے چراغ جلنے کا یہ سلسلہ ہر روز سائیں جاوید کے معتقدین کی تعداد میں اضافہ کرتا۔

اس کی تشخیص کے ایام کار میں سے کچھ دن آپریشنوں کے لیے مخصوص تھے جہاں مختلف پیچیدہ امراض کے روحانی آپریشن سرانجام دیے جاتے۔ یہ آپریشن اس طرح کے ہوتے کہ مریض کو لٹا دیا جاتا اور سائیں جاوید اپنے موکلات کے ذریعے ان کا آپریشن سرانجام دیتا۔خود ان کے بدن کے اس حصے پر جس کا آپریشن مطلوب ہوتا یوں لائن پھیرتا جیسے واقعی آپریشن کر رہا ہے۔جس کا آپریشن کیا جاتا وہ بھی جسم میں نقاہت اور درد کی کیفیات محسوس کرتا۔اس آپریشن کے بعد وہ ان مریضوں کو رخصت کرنے سے پہلے کچھ ہدایات اور احتیاطیں بتاتا اور ادویات دے کر رخصت کر دیتا۔حیرت انگیز طور پر مریض اس کے آپریشنوں اور اس کے دیے گئے نسخوں سے شفا پاتے۔ان سب کے بدلے میں وہ کسی سے کچھ بھی طلب نہیں کرتا تھا۔

جو لوگ سائیں جاوید کے آستانے یا مطب پر گئے ہیں وہ اس حوالے سے گواہی دے سکتے ہیں کہ جس طرح مخلوق خدا ٹوٹ ٹوٹ کر حاضر ہوتی اور اپنی حاجات لے کر حاضر ہوتی اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو

یقیناً اپنی دنیا اورلوگوں کی عاقبت سنوار لیتا۔ وہ اتنا کچھ جوڑ اور بنا کر جاتا جو اس کی سات پشتوں کے لیے کافی ہوتا مگر سائیں جاوید نے ایسا کچھ نہیں جمع کیا۔ ایک عام سا ٹین کا شیڈ نما مطب جسے کے اندر اور باہر نام کے چند بینچ اور کرسیاں ہمہ تن موجود ہوتیں جن پر مریض اور ان کے ساتھ آنے والے اپنی باری کے انتظار کے دوران بیٹھتے۔ ایک معمولی سا ہوٹل جس پر دور سے اور بے وقت آنے والوں کے لیے رہائش کا بندوبست کیا جاتا، چند ایک گنتی کی دکانیں اور ان کے بالکل سامنے سڑک کی دوسری طرف درمیانے سائز کی ایک مسجد جس میں ایک وقت میں سو کے لگے بھگ نمازی نماز ادا کر سکتے تھے۔ یہ سارا سائیں جاوید کے مطب کا وہ نقشہ ہے جو اس کے پاس آنے والوں کو از بر تھا۔

ایک بار کسی بات پر سائیں جاوید سے ایک ریڈیو انٹرویو میں پوچھا گیا کہ آپ کے پاس اتنے لوگ آتے ہیں آپ کو اتنا کچھ دینے کی پیشکش کرتے ہیں اور بعض تو زبردستی پھینک کر چلے جاتے ہیں۔ آپ کو اللہ نے اتنی زیادہ شہرت اور عزت دی ہے۔ کیا آپ کو یہ سب دیکھ کر اور اتنی زیادہ عزت پا کر غرور و تکبر نہیں آتا۔ اس پر سائیں جی کا جواب کتنا خوبصورت تھا ذرا ملاحظہ کریں۔ جی ہاں مجھے بھی اس طرح کے لوگوں کے برتاؤ اور اللہ کے اس فضل پر کبھی کبھی غرور آنے لگتا ہے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو میں سیدھا مسجد میں چلا جاتا ہوں اور مسجد کے بیت الخلا صاف کرنے لگتا ہوں، وہاں جھاڑو دیتا ہوں اور اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ: ''سائیں جاوید تجھے جو عزت دی ہے وہ اللہ نے دی ہے ورنہ تیری تو یہ بیت الخلا صاف کرنے کی بھی اوقات نہیں تھی۔'' اس طرح مجھ سے تکبر غائب ہو جاتا ہے اور میں پھر سے اپنے کام میں منہمک ہو جاتا ہوں۔

ایک مرتبہ ہم لوگ گپ شپ کر رہے تھے تو کسی حوالے سے کہنے لگے کہ ایک مرتبہ میں اپنے مطب پر مریضوں کا چیک اپ کر رہا تھا۔ نماز کے وقفہ کے دوران مسجد کی طرف جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک بہت مفلوک الحال شخص ایک طرف اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ میرا معمول تھا کہ میں باہر آتے جاتے راستے میں ملنے والوں کی خیریت دریافت کرتا۔ تو میں نے اس سے بھی پوچھا کہ آپ کا کیا حال ہے کیسے آنا ہوا ہے؟ اس پر وہ کہنے لگا کہ سائیں میں سندھ سے آیا ہوں دل کی تکلیف ہے اور کسی نے سائیں جاوید کے بتایا ہے اس سے ملنے آیا ہوں۔ میں نے اسے حال احوال دریافت کر کے وقفہ کے بعد مطب میں آنے کا کہا۔ مطب میں تشخیص کے

دوران اس کے مرض کی نوعیت کے مطابق اس کا آپریشن تھا جو تین دن بعد ہونا تھا۔اس پر میں نے اس سے استفسار کیا کہ اس کا آپریشن تین دن بعد ہوگا کیا وہ تین دن انتظار کرلے گا۔اس پر اس نے کہا کہ مجبوری ہے انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں قیام کرے گا تو وہ بولا کہ وہ یہاں کسی کو بھی نہیں جانتا نہ اتنے پیسے ہیں کہ ہوٹل میں قیام کرے لہذا ادھر باہر بینچ پر ہی رہ لے گا۔اس پر میں نے اپنے ساتھ موجود لڑکے کو بلا کر کہا کہ ان کو ساتھ ہوٹل پر لے جاؤ اور وہاں ان کو کمرا لے کر دو اور کھانے کا انتظام بھی کرو۔ شام کو آپریشن والے مریضوں کی فہرست دیکھتے ہوئے میری نظر مکیش نام کے مریض پر پڑی اور اس کا پتہ سندھ کا تھا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ یہ مکیش وہی مفلوک الحال شخص ہے۔میں نے فوراً لڑکے کو بلایا اور اسے کہا کہ ہوٹل والوں کو جا کر بتاؤ کہ اس کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہ کریں اور یہ کہ وہ مریض کھانا میرے ساتھ کھائے گا۔

کھانے کی میز پر جب اسے بلایا گیا تو وہ میرے ساتھ کھانا نہیں کھا رہا تھا، میں نے بہت اصرار کیا کہ وہ میرے ساتھ کھانا کھائے مگر وہ انکاری تھا کہ سائیں میں کمی کمین آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتا۔ میں نے بتایا کہ ہمارے ہاں یہ کچھ نہیں ہوتا تم کھانا کھاؤ مختصراً اگلے چار دن تک وہ اسی طرح روزانہ میرے ساتھ کھانا کھاتا بیٹھتا بات کرتا۔آپریشن کے بعد جب واپس جانے لگا تو میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ سائیں میں ہندو ہوں مجھے آپ مسلمان کرلیں۔ میں نے کہا بھائی آپ اپنے کام سے آئے ہیں آپ کا کام ہوگیا ہے بس آپ جائیں ایک دم ایسے مسلمان ہو کر کیا کریں گے۔ بہت دیر تک ہمارے درمیان یہ بات رہی بالآخر وہ دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوگیا۔

ایک دن میں اپنے گھر میں موجود تھا کہ مجھے ایک نمبر سے کال آئی میں نے کال اٹینڈ کی تو آگے وہی شخص بول رہا تھا کہ سائیں میں مکیش بول رہا ہوں جس کا آپ نے علاج کیا تھا۔ میں اپنے پورے کنبے کے ساتھ اپنے علاقے کی مسجد میں آیا ہوں اور ہم سب مسلمان ہو رہے ہیں۔ میں نے آپ کو کال اس لیے کی ہے کہ میں مسلمان ہونے میں آپ کو گواہ بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے آج سے پہلے کبھی مسلمان دیکھے ہی نہیں تھے۔ آپ سے مل کر مجھے پتہ چلا کہ مسلمان کیسے ہوتے ہیں اس لیے اب اپنی مرضی سے اسلام لا رہا ہوں۔اس طرح فون کال پر میری موجودگی میں مکیش کا سارا خاندان مسلمان ہوگیا۔

سائیں جی نے سختی سے آنے والوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ مطب میں صرف سو دو سو روپے کی حد تک پیسے دے کر جائیں پانچ سو اور ہزار کا نوٹ کسی صورت نہ ڈالیں اور یہ پیسے بھی وہ صرف اس لیے وصول کرتے تھے تاکہ جڑی بوٹیوں کے حصول اور اس کی تیاری پر جو لاگت آتی ہے وہ پوری ہو سکے۔اس کے برعکس لوگ جب شفایاب ہو کر واپس جاتے تو بڑے بڑے تحائف لے کر حاضر ہو جاتے اور زبردستی دے کر جانے کی کوشش کرتے مگر وہ انہیں کسی صورت قبول نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ میرپور سے ایک انگلینڈ پلٹ شخص دل کے عارضہ کے سبب ان کے پاس حاضر ہوا جس کی ڈاکٹرز نے اوپن ہارٹ سرجری کی تشخیص کی تھی۔سائیں جی کے علاج سے وہ تندرست ہو گیا اور جب اس کی ہسپتال سے تمام رپورٹس نارمل آ گئیں تو سائیں جی سے ملنے کے لیے میرپور سے باغ آیا، ملاقات کی بہت دیر تک باتیں کی اور جاتے ہوئے ایک پراڈو گاڑی زبردستی چھوڑ کر جانے لگا۔سائیں جی نے منع کر دیا کہ انہیں ان تحائف کی نہ تو ضرورت ہے نہ ہی اجازت ہے مگر وہ جاتے ہوئے باہر گاڑی اور اس کے کاغذات ہوٹل پر چھوڑ کر چلا گیا۔سائیں جی کو جب اس کا پتہ چلا تو انھوں نے دوبارہ اس سے رابطہ کیا۔اپنے ڈرائیور کو گاڑی حوالہ کی کہ اسے میرپور جا کر چھوڑ کر آ جاؤ۔یوں ڈرائیور گاڑی میرپور اس کے گھر میں چھوڑ کر واپس آیا تو سائیں جی کو سکون ہوا۔

کتنے ہی ایسے شعبے تھے جن کا روزگار سائیں جاوید کے ساتھ منسلک تھا کیا باغ کا ہوٹلنگ کا شعبہ، کیا باغ کا ٹرانسپورٹ کا شعبہ، کیا سیر وسیاحت سے منسلک لوگ، کیا لوکل تاجر ہر ایک کا روزگار کہیں نہ کہیں سائیں جاوید کے پاس آنے والے مریضوں اور زائرین سے وابستہ تھا۔شام ہوتے ہی سینکڑوں گاڑیاں باغ میں داخل ہوتیں، باغ مین پُل پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد رکتی، سائیں جاوید کے مطب کی طرف جانے والی سڑک، راستے اور رہائش کا پوچھتی اور روانہ ہو جاتیں۔اس کے مطب کے اوقات کار سب کے لیے یکساں تھے۔کوئی اس کے لیے بہت وی آئی پی اور کوئی سائل نہیں تھا۔سب ہی اس کے لیے قابل احترام ہوتے، سب کے ساتھ اس کا سلوک یکساں تھا۔کسی کو مشکل میں دیکھ لیتا تو فوراً اس کے حل کے لیے کوشاں ہو جاتا۔کوئی شخص بھی اس کے پاس گیا اور اسے کسی کی پریشانی یا آزمائش کا ذکر کیا ہو گا سائیں جاوید نے اپنی بساط سے بڑھ کر

اس کے ساتھ تعاون کیا ہوگا۔اس کی یہی وہ خوبیاں تھی جو اسے دوسروں سے جدا کرتی تھی۔

ہم میں سے ہر ایک شخص زندگی کے کسی نہ کسی شعبے سے وابستہ ہے اور اپنی بساط کے مطابق اس شعبے کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے خدمت خلق کرتا ہے۔ہم میں سے ہر ایک کی عزت اور شہرت کا دائرہ مختلف بھی ہوتا ہے اور منفرد بھی۔ہر ایک کا معاشرے میں کردار منفرد ہوتا ہے اور اسی انفرادیت کے ساتھ معاشرے میں نفوذ بھی کرتا ہے۔لیکن ایک ایسا شخص جس کے بارے میں عام رائے یہی رہی کہ وہ کوئی بہت زیادہ پڑھا لکھا، کسی یونیورسٹی یا جامعہ سے فارغ التحصیل ہونے کی بجائے محض ''سائیں'' ہے اس کا اثر اس کا نفوذ اس کی شہرت اور باغ کے مثبت تاثر کو دنیا بھر میں اجاگر کرنے کے حوالے سے کردار یقیناً یہ سائیں جاوید ہی ہوسکتا تھا۔

سائیں جاوید سے ہمارے تعلق کی وجہ ہمارا مشترکہ دوست ابرار یونس رہا اس نسبت سے بہت سی شامیں ہماری ایک ساتھ گزریں۔وہ جب مطب میں دن بھر مریضوں کے ساتھ مشقت بھرا دن گزار کر کچھ لمحات اپنے ساتھ گزارنا چاہتا تو ابرار یونس کو فون کرتا اور پھر آستانہ ابراریہ پر حاضر ہو جاتا۔ایک ایک کر کے سارے دوست اکٹھے ہوتے جاتے اور یوں ہمارا قافلہ کسی انجانی منزل کی طرف رواں ہو جاتا جہاں علائق دنیا سے دور دوستوں کے درمیان فرصت کے لمحات گزرتے۔اپنے آستانے پر مریضوں کا مسیحا کوئی اور سائیں جاوید تھا اور دوستوں کے درمیان بیٹھا ہوا کھلنڈرا سا سائیں جاوید اس سے یکسر مختلف جہاں کوئی خاص نہیں کوئی عام نہیں۔سب ایک دوسرے کے لیے خاص اور سب ایک دوسرے میں بہت عام۔کوئی آفیسر نہیں کوئی عہدیدار نہیں،کوئی سٹیٹس کو لے کر اس محفل میں بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ میں نے ہر ایک ملاقات میں سائیں جاوید کو ہمیشہ ''عام'' ہوتے ہوئے ''خاص'' دیکھا۔اگرچہ اس کا تعلق محض مرّ نہ اور بیر پانی سے تھا مگر اس کا تعلق پورے باغ اور کشمیر سے اس طرح سے جڑا تھا کہ ہر علاقہ اس کا اپنا علاقہ تھا۔

بعض اوقات دوستوں میں سے کوئی سائیں جاوید سے کہہ دیتا کہ سائیں صاحب آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔مذاق میں کہیں آپ کی شان میں گستاخی کا پہلو نہ نکل آئے تو کہتے کہ مجھے آپ لوگ بہت دیر سے ملے۔میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دوستوں کا ایسا بھی کوئی حلقہ ہوسکتا ہے جہاں کارِفرصت کے لمحات یوں

گزارے جاسکتے ہیں جہاں کوئی خاص نہیں جہاں کوئی عام نہیں۔سب ایک دوسرے سے منسلک اور سب ایک دوسرے کی محبت میں سرشار۔یہیں آ کر تو مجھے اس گم شدہ سائیں جاوید سے ملاقات ہوتی ہے جو جانے کب سے دنیا کے ان بکھیڑوں میں پڑ کر خود سے لاتعلق ہو بیٹھا تھا۔

لوگوں کے درمیان خوشیاں اور صحت بانٹنے والا سائیں جاوید کب خود مریض بن گیا یہ شاید اس کو بھی خبر نہیں تھی اور ہم میں سے کسی کو بھی اس کا کوئی پتہ نہیں تھا نہ اس نے خود اس کی خبر ہونے دی۔ابرار یونس اس کو راولپنڈی لے گیا،ٹیسٹوں کی رپورٹ میں اس کے پیچیدہ مرض سرطان کی تشخیص ہونے پر ان دونوں کی اگلی منزل کراچی بنی جہاں جناح ہسپتال کے شعبہ انکالوجی کی خدمات اور سائبر نائف کا شہرہ تھا۔وہاں دو ماہ تک زیر علاج رہنے اور پیچیدہ آپریشنوں سے گزر کر سائیں جاوید ایک بار پھر ہمارے درمیان تھا اور ایک بار پھر اپنے مریضوں اور چاہنے والوں کو صحت و خوشیاں بانٹ رہا تھا۔

کہنے والوں نے اس کے بارے میں بہت کچھ کہا کہ اگر وہ خود حکیم،ڈاکٹر اور سرجن تھا تو اپنا علاج خود کیوں نہیں کیا۔اسے اپنے پیچیدہ مرض کی خبر خود کیوں نہیں ہوسکی،اس نے اپنا آپریشن خود کیوں نہیں کیا،اس کے موکلات نے اس کی مدد کیوں نہیں کی؟ان تمام سوالات سے قطع نظر سائیں جاوید کی اگلی منزل وہی مرّ نہ اور وہی مطب تھا جہاں اس کے مریض اس کے منتظر تھے اور جن کو شفا بانٹنے کا فریضہ قدرت نے اس کے سپرد کر رکھا تھا۔سو وہ واپس اپنے آستانے پر پہنچ کر پھر سے ہمہ تن اپنے کام میں جت گیا۔

ابھی اس پیچیدہ مرض سے صحت یاب ہوئے اسے سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک بار پھر آزمائشوں نے اس کے گھر بار میں ڈیرے ڈال لیے۔سرطان اب کی بار اس کی جسمانی قوت کے برعکس زیادہ قوت سے اس پر حملہ آور تھا۔ابرار یونس ایک بار پھر اس کے مشکل وقت میں اس کا وسیلہ بنا اور دوبارہ راولپنڈی کے لیے عازم سفر ہوا۔مرض کی پیچیدگی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ تکلیف نے سائیں جاوید کے لیے چلنا پھرنا دوبھر کر دیا۔کیموتھراپی،ریڈی ایشن اور دیگر ادویات کے ذریعے سرطان کے مقابلے کی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لایا گیا۔اس ساری مشقت میں اس کا بدن اور اس کے جسم کا دفاعی نظام ہر گزرتے دن کے ساتھ اور کمزور ہوتا چلا گیا۔کئی ماہ اسی کشمکش میں گزر گئے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دعا کی کہ مصداق بیماری میں شدت آتی گئی

۔اس نے خاموشی کے ساتھ ہر دکھ ہر تکلیف کا مقابلہ کیا، زبان سے کوئی ایک بھی ناشکری کا کلمہ ادا نہیں کیا۔ ہر دن اس امید کے ساتھ گزارا کہ شاید اس مرض کا ازالہ ہو سکے۔اس ساری بیماری میں ابرار یونس باقی سب سے زیادہ فکر مند رہ کر عملاً اس کے علاج کے لیے ہر پل کوشاں رہا۔ جو کچھ وہ کر سکتا تھا اور جس طرح اس کا بندوبست کر سکتا تھا کرتا رہا۔مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ علاج تو بیماریوں کا ہوتا ہے موت کا کوئی علاج نہیں۔ دوا تب شفا بنتی ہے جب زندگی کے دن ابھی باقی ہوں ورنہ تو صحت اور علاج کے اندر سے ایسے اسباب نکل آتے ہیں جو انسان کی موت پر جا پہنچتے ہیں اور انسان چاہ کر بھی اس سے فرار نہیں اختیار کر سکتا۔ سائیں جاوید کا بھی یہی معاملہ تھا، جہاں سارے اسباب اس کی زندگی کی بجائے موت کی طرف لے جا رہے تھے۔اس طرح ہزاروں زندگیوں کا مسیحا خود اپنی زندگی کی جنگ لڑتے لڑتے داعی ملک عدم روانہ ہو گیا۔

اس کے تعزیتی ریفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ایک مولانا صاحب نے تعزیتی کلمات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ سائیں صاحب کے جو موکلات ان کی زندگی میں ان کے ہمنوا اور خیر خواہ تھے ہم ان سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ یہاں رہتے ہوئے لوگوں کی زندگیوں میں آسانیاں بانٹتے رہیں اور سائیں صاحب کا خلا پورا کریں۔مگر حقیقت اس کے برعکس ہے آج جب مطب سائیں جاوید کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ درودیوار وہیں ہیں۔ وہاں کے سارے باسی وہیں آباد ہیں۔لیکن ایک شخص جو اس جگہ کی رونق تھا وہ نہیں ہے اور اس کے نہ ہونے کا خلا شاید کوئی بھی پورا نہ کر سکے۔ان کے اہل خانہ اور نہ ہی ان کے وہ موکلات جن کے بارے میں کسی نے تعزیتی ریفرنس میں گزارش کی تھی کہ وہ یہیں رہتے ہوئے رونق علاقہ اور خیر بانٹتے رہیں۔

☆☆☆

عہدِ ناتمام

زندگی ہمیں ایک ایک دن کر کے مارتی ہے، ایک ایک گھڑی ایک ایک لمحہ کر کے مارتی ہے۔ بھگا بھگا کر مارتی ہے تھکا تھکا کر مارتی ہے۔ ایسے میں کامیاب وہی ہے جو اس زندگی کے چند پل چرا کر جو لمحے میسر ہوں ان میں جی لے اور اپنے پیچھے ایسا کچھ چھوڑ جائے جو اس کے فانی ہونے کے بعد بھی باقی رہے۔

پروفیسر بشیر عباسی اب ہم میں نہیں رہے، یہ محض ایک میسج ایک اطلاع ہی نہیں میرے لیے وہ لمحہ سالوں پر محیط لگا جس نے مجھے ساکت کر کے رکھ دیا۔ کچھ وقت کے لیے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت سے عاری کر دیا۔ جی ہاں پروفیسر بشیر عباسی بھی راہی ملک عدم ہو گئے۔ ایک عہدِ ناتمام بالآخر تمام ہو گیا۔

اگرچہ ہم میں سے ہر ایک پیدا ہی مرنے کے لیے ہوتا ہے مگر اس فانی دنیا کا کیا کیا جائے یہاں تو ہر کوئی عمر خضر کی تمنا لے کر آتا ہے۔ زندگی کی ساٹھ ستر بہاریں دیکھ کر بھی یہی حسرت لیے بجھے دل سے رخصت ہوتا ہے کہ

یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکا
کھلا ضرور مگر کھل کر مسکرا نہ سکا

ہمارے ہاں پبلک سروس سے وابستہ ہونے کے بعد پیرانی سالی کی ایک طبی عمر فرض کر لی گئی ہے اور اس کی تکمیل پر خوشی یا ناخوشی ملازمت سے الگ ہونا ہی پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے دوران سروس کسی کا یوں دنیا سے منہ موڑ لینا وہ عہدِ ناتمام ہے جو اپنے پیچھے بہت سے حوالے چھوڑ جاتا ہے۔

گورنمنٹ بوائز پوسٹ گریجویٹ کالج باغ کے لیے یہ سال پے در پے صدمات لیے ہوئے ہے۔ پہلے پروفیسر محمد خلیل کا سفر آخرت پھر پروفیسر منور راجہ کا اچانک انتقال پھر ادارے کے ملازم سدھیر کا چلے جانا

اوراب پروفیسر بشیر عباسی کا بظاہر ایک چھوٹے سے حادثے کا یہ اندوہناک انجام۔۔۔۔

پروفیسر بشیر عباسی بلاشبہ اپنی ذات میں خود ایک انجمن تھے جو کسی جیسے نہیں بلکہ خود اپنے جیسے تھے۔ قد لگ بھگ چھ فٹ، چوڑا سینہ، گورا گندمی مائل چہرہ اور عمر کے ساتھ ساتھ بھرا ہوا بھرپور جسم، ہمیشہ شلوار قمیص میں ملبوس چہرے پر ایک خاص مسکراہٹ سجائے رہنا اور تیز قدموں کے ساتھ چلنا یہ ان کا سارا وہ حلیہ تھا جس سے ہر عام وخاص واقف تھا۔ ان کا خاندان مقبوضہ کشمیر کے ضلع بارہ مولہ کی تحصیل اوڑی کے گاؤں گوالتا سے ہجرت کر کے تقسیم برصغیر کے ہنگاموں میں ضلع باغ کے مضافاتی گاؤں ہنسلہ اسلام نگر میں آباد ہوا۔

ان کی زندگی کا ابتدائی عرصہ محنت اور مشقت سے بھرپور تھا۔اس سارے عرصہ میں ہر طرح کی محنت مشقت کر کے معمولات زندگی کو آگے بڑھاتے رہے اور ساتھ ساتھ تعلیم کی تکمیل بھی کرتے رہے۔ایم ایس سی معاشیات کی ڈگری جامعہ کشمیر مظفرآباد سے حاصل کی۔سروس میں آنے سے پہلے کئی طرح کے کام کر کے عملاً سیلف میڈ شخص کی عملی تفسیر بنے رہے۔یوں بہت سے ہنر ان کی ذات میں کچھ اس طرح رچ بس گئے کہ وہ ہر فن مولا کہلائے۔جوتے مرمت سے لے کر کپڑے سلائی تک کون سا ایسا ہنر تھا جس سے وہ واقف نہ تھے اور جس کا وہ اپنی روزمرہ زندگی میں استعمال نہ کرتے تھے۔تھوراڑ سے ایڈہاک لیکچرار کے طور پر ملازمت کا آغاز کیا، وہاں سے کہوٹہ ٹرانسفر ہوئے یہیں رہتے ہوئے 1996ء میں پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور لیکچرار معاشیات تعینات ہوئے۔بعدازاں ٹرانسفر ہو کر پوسٹ گریجویٹ کالج باغ آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے اگلے چھبیس سال یہیں گزر گئے۔

عمر کی نصف سنچری کی تکمیل اور محکمانہ سروس کی طوالت نے انہیں اپنے پیشہ وارانہ ہم جولیوں میں ممتاز کر رکھا تھا۔اس حوالے سے بعض اوقات پرنسپل ادارہ کی عدم موجودگی میں انہیں قائم مقام سربراہ ادارہ کی ذمہ داریاں سرانجام دینا پڑتیں تو اپنے تمام قائم مقام سربراہانِ ادارہ کے برخلاف کبھی پرنسپل کی کرسی پر بیٹھ کر ذمہ داریاں سرانجام نہ دیتے۔وہ کہا کرتے کہ اگر فوج میں سینئر افسر کی عدم موجودگی میں جونیئر افسر اپنے دفتر میں بیٹھ کر سب امور سرانجام دیتا ہے تو یہاں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا اور ایسا کیوں کیا جاتا ہے کہ سربراہ ادارہ کے جاتے ہی قائم مقام سربراہ ادارہ ایک دم اس کی کرسی پر براجمان ہو جاتا ہے۔

اپنی ساری پیشہ وارانہ رفاقت میں ہمیشہ ایک پرعزم، اپنے مضمون پر مکمل عبور رکھنے والے، چہرے پر مسکراہٹ، ہاتھ میں عصا اور بیگ لیے کالج آتے فرداً فرداً سب سے ملتے اور اسی انداز سے کلاس میں جاتے۔ روزانہ ہی کلاس کے خاتمہ پر دوبارہ ملتے ہی کوئی شعر، جملہ یا اپنی کلاس میں کہی گئی کوئی خاص بات یا موضوع سناتے کہ آج میں نے کلاس کو یہ نئی بات سکھائی ہے۔ آج کلاس میں یہ نئی بات ہوئی ہے اور پھر اس بات کا حظ اُٹھاتے جو وہ کلاس کو نئی بتا کر آئے ہوتے۔ ان کا پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ طلبہ ان کی کلاس کو زیادہ سنجیدہ نہ لیتے۔ اس پر فوراً اپنی ''سوٹی'' کو سیدھا کر لیتے مگر یہ ان کا وہ انداز تھا جو بس انہی پر جچتا تھا۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد کے مصداق ہمیشہ عصاء بشیری کے ساتھ کالج آنا، ہم جولیوں کے سامنے ''سوٹی'' کے ساتھ 'گتکا' کا انداز اپنانا اور پھر اسی سوٹی کے ساتھ کلاس میں جانا۔ یہ الگ بات کہ عمر بھر یہ عصا دکھانے کے کام ہی آتا رہا چلانے کی نوبت نہ آسکی۔ ان کی ایک اور بات بھی منفرد تھی کہ وہ جہاں بیٹھتے اپنی سوٹی کو فرش یا زمین پر بغیر کسی سہارے کے معلق کر دیتے۔ اس بات پر پھر شرطیں لگ جاتی کہ کسی اور میں دم ہے تو وہ یہ کارنامہ بغیر سہارے کے کر کے دکھائے۔ مجال ہے کہ سالوں کی اس رفاقت میں کسی کو ہم نے بشیر عباسی کے مقابلے میں جیتتا دیکھا ہو۔ ادارہ کی طرف سے اساتذہ کی پیشہ وارانہ مہارتوں سے متعلق طلبہ سے جب خفیہ تحریری آرا لی جاتیں تو سب سے دلچسپ آراء بشیر عباسی کے متعلق ہوتی۔ ان دلچسپ آراء کے پیچھے عموماً ان کا وہ انداز تکلم ہوتا جو وہ دوران کلاس طلبہ کے ساتھ برتتے اور جو عموماً ان کی مادری زبان کے چٹکلوں اور آرا پر مبنی ہوتا اور آراء بھی ویسی جن کے بارے میں بقول یوسفی گالی، گنتی، سرگوشی اور گندہ لطیفہ مادری زبان میں ہی مزا دیتا ہے۔

فری پریڈ میں اپنے ہم جولیوں کے ساتھ بیٹھنا اور اپنے مزے دار چٹکلوں سے محفل کو کشت زعفران بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کوئی بات ہوتی اس سے متعلق فوراً ''آخان'' یا چٹکلا چھوڑتے۔ اپنے رفقاء سے مفت کی چائے پینا محبوب مشغلہ تھا، بعض اوقات باقی رفقاء ان کے ساتھ شرط لگاتے کہ آج چائے پروفیسر بشیر عباسی پلائیں گے تو کہہ دیتے آج آپ پلا لو میں کل پلاؤں گا اور مجال ہے کہ وہ کل کبھی آیا ہو۔ کالج میں کوئی پروگرام یا کسی طرح کی تقریب ہوتی تو ''امور کھانا داری'' ہمیشہ بشیر عباسی کے پاس ہوتے۔ تقریب کے

مارے تھکے ہارے پروفیسر جب ''جائے طعام'' پر پہنچتے تو بشیر عباسی اپنی پوری ٹیم کے ساتھ ون ٹو تھری ''گو'' کی پوزیشن میں ہوتے۔ایک ایک کی ضرورت کا خیال رکھتے اور سب سے آخر میں خود کھاتے۔

بشیر عباسی کی ایک اور بڑی خوبی جوان کو اپنے ہم جولیوں میں ممتاز کرتی تھی وہ ان کا ہرفن مولا ہونا اور اپنی تہذیب اپنی مٹی کے ساتھ جڑا ہونا تھا۔جہاں سے بھی تہذیب و ثقافت سے وابستہ کوئی چیز ملتی اسے ضرور حاصل کرتے اور یوں گھر میں نوادرات جمع کرتے جاتے۔اسی طرح ہرفن مولا ہونے کے حوالے سے یہ حال تھا کہ کسی بھی کام کا ان کو کہیں وہ اس کو ایسے پیشہ ورانہ انداز میں سرانجام دیتے کہ انسان دیکھتا رہ جاتا۔ ایک دفعہ کالج میں پرانے فرنیچر کی نیلامی ہوئی اور ناقابل استعمال لکڑی کی طلبہ کی کرسیاں وغیرہ فروخت ہونے لگی تو نیلامی کی بولی دینے والوں میں بشیر عباسی بھی تھے۔چونکہ ان کی بولی دیگر تمام شرکاء کی بولی سے زیادہ تھی اس لیے وہ سارا ناکارہ فرنیچر بشیر عباسی خرید کر گھر لے گئے جو اندازہ تھا کہ جلانے کے کام آئے گا۔کچھ دن کے بعد تذکرہ کرنے لگے کہ وہ جو ناکارہ فرنیچر میں گھر لے گیا تھا اس کو میں نے کارآمد بنالیا ہے آپ چلیں میرے ساتھ میرے گھر میں آپ کو دکھاتا ہوں۔

ان کی دعوت پر جب ہم ان کے گھر گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان ناکارہ کرسیوں کی پھٹیوں کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم کی ناقابل یقین حد تک خوبصورت ''پیلنگ'' کر کے دیواروں کو ایسا خوب صورت بنادیا تھا کہ ڈرائنگ روم کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔کہنے لگے کہ میں جب کرسیاں گھر لایا تو خیال آیا کہ کیوں نہ ان چھوٹی چھوٹی پھٹیوں کو کاٹ کر ان کی اینٹیں بناؤں اور اس سے گھر کے درو بام سجالوں۔پھر کہنے لگے کہ یہ میرا گھر جو آپ دیکھ رہے اس میں چند کاموں کو چھوڑ کر سارا گھر میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔اس میں لگی ہوئی ایک ایک چیز میرے ہاتھ کی بنی ہوئی ہے۔میں کپڑے تک درزی سے سلائی نہیں کراتا،اپنے کپڑے خود ہی سی کر پہنتا ہوں،اپنے سارے کام میں خود ہی کرتا ہوں۔کیا کمال کی ذہانت پائی تھی اور شخصیت میں کیا کیا کمال رکھتے تھے کہ ہرفن مولا اور ہر کام میں دوسرے سے بڑھ کر بالکل اس مصرع کے عین مطابق کہ

''ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی''

ایک ہی ذات میں اتنے سارے کاموں اور ہنروں کا ایک ساتھ جمع ہو جانا بلاشبہ ایسے لوگ اب ڈھونڈے

سے بھی نہیں ملتے۔

پرانی ایشیا جمع کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا جہاں سے بھی تہذیب سے جڑی کوئی قدیم چیز ملی اور جس دام بھی ملی اس کو خرید لیتے۔ان کا گھر ایک منی عجائب گھر کا منظر پیش کرتا جس میں ہر رنگ ہر نسل کے ریڈیو، سامان الیکٹرونکس، روایتی دیسی تہذیب کی نشانیاں مثلاً چرخا، پولیں، پھنڈی، ہاتھ سے بنی دھان کی جائے نماز، پرانے ہتھیار جو بھی جیسا بھی جہاں سے دستیاب ہوا اسے منہ مانگی قیمت پر خریدا اور گھر کی زینت بنایا۔ جب بھی پنڈی اسلام آباد جانا ہوتا تو پرانی اشیا کے مراکز میں ضرور جاتے اور اپنی من پسند چیزوں کی خریداری کرتے۔

لنڈے کی چیزوں کی خریداری ان کا محبوب مشغلہ تھا اس وجہ سے موسم سرما ان کا محبوب موسم ہوتا کیوں کہ اس موسم میں لنڈے کی دکانوں پر ہر طرح کی ورائٹی میسر ہوتی۔ان کی اپنے رفقاء کے ساتھ اس معاملے میں عموماً نوک جھونک رہتی۔انہی رفقاء میں سے کسی نے شرارتاً اخبار میں خبر لگوادی کہ ممتاز ماہر تعلیم جناب پروفیسر بشیر عباسی کا افسانوی مجموعہ ''لنڈے کا بوٹ'' منظر عام پر آ گیا ہے۔اس بات پر کچھ دن اپنے ساتھیوں سے اُن کی اَن بن ضرور رہی مگر چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی کہ مصداق ان کی لنڈے سے محبت ان سے کبھی دور نہ ہوسکی۔

بحیثیت قوم جس تہذیبی انحطاط کا ہم سب شکار ہیں اس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ ہم نے غیروں کی پیروی میں اپنی تہذیب کو نہ صرف پس پشت ڈالا ہے بلکہ اب تو ہم بھول ہی چکے ہیں کہ ہماری بھی کل تک کوئی تہذیب وثقافت تھی۔اب تو خال خال ہی کچھ لوگ ہوں گے جو خون جگر کے ساتھ اس مرتی ہوئی تہذیب کو زندہ کرنے کی تگ و دو میں ہیں۔بشیر عباسی اس مٹتی ہوئی تہذیب کے آخری علمبرداروں میں سے تھے جو اس کے احیاء کے لیے ہر دم تیار رہتے۔کہیں سے کوئی بھی مٹتی تہذیب کا حوالہ ملا اور جس دام بھی ملا اسے ضرور منہ مانگے داموں خرید کر گھر لاتے۔ پھر آ کر دوستوں کو سناتے۔اپنی سادہ وضع وقطع پر عمر بھر بناوٹ کا کوئی خول نہیں چڑھایا نہ ہی چڑھنے دیا۔جیسے گھر میں ہوتے ویسے ہی گھر سے باہر بھی رہتے۔کھانے پینے سے لے کر پہننے اور اوڑھنے بچھونے تک سادگی کا پیکر رہے، ہمیشہ کم کھایا، کم پہنا اور بہت کم کسی چیز پر کچھ خرچ کیا ہوگا اس کی ایک

وجہ شاید ان کی ابتدائی زندگی کی وہ مشکلات تھیں جن سے گزر کر وہ آسودگی کے اس دور تک پہنچے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کی وہ سادگی تھی جس پر ہمیشہ قائم رہے اور اسی سادگی پر دنیا سے رخصت ہوئے۔

مشیت ایزدی کہ اولادِ نرینہ سے محروم رہے مگر اس محرومی کو کمزوری بنانے کی بجائے اپنے بھتیجے کو متبنیٰ بنا کر رکھا۔ اس کی بیٹے کی طرح پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم سے یونیورسٹی تک کی تعلیم سے روشناس کرایا۔ ہر پہلو سے اس کا خیال رکھا اور اسے اس مقام تک پہنچایا جہاں کوئی بھی باپ اپنی اولاد پر فخر کر سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں کیا بلکہ اپنے بھائی کے دیگر بچوں کی بھی آخری سانس تک کفالت کرتے رہے۔ یہ ان کی زندگی کا وہ صدقہ جاریہ ہے جس کا فیض تاعمر ان کو پہنچتا رہے گا۔

جہاں تک استاد ہونے کا تعلق ہے میرے نزدیک استاد اس حوالے سے باقی تمام شعبہ جات سے وابستہ لوگوں سے مختلف ہوتا ہے کہ اس کا ہر طالب علم اس کی وہ اولادِ نرینہ ہے جو اس کے جلائے ہوئے علمی چراغوں کو نسل در نسل آگے بڑھانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ مجھے یقین ہے بشیر عباسی جس سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے اپنے پیچھے ایسے ہزاروں چراغ روشن کر کے گئے ہیں جو تا ذیست ان کے سفرِ آخرت میں قندیلیں بن کر صدقہ جاریہ کی صورت ان کی منازل کو منور کرتے رہیں گے۔ ایک اچھا استاد کبھی نہیں مرتا۔ اس کا سفرِ حیات اس کے شاگردوں کی صورت میں ہمیشہ جاری وساری رہتا ہے، بقول احمد ندیم قاسمی

کون کہتا ہے کہ موت آئے گی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

کچھ عرصہ سے عرق النسا نے ایسا گرفت میں لیا کہ کئی بار کلاس چھوڑنا پڑی مگر پھر بھی کالج پہنچتے۔ بعض اوقات درد کی شدت اس حد تک طاری ہوتی جو گھر رکنے پر مجبور کر دیتی اس کے باوجود اپنی اسی ''سوٹی'' کے سہارے کالج پہنچتے۔ اسی عرق النسا نے ان کے سفرِ آخرت کی راہ ہموار کی۔ کالج آتے ہوئے تیز رفتار موٹر سائیکل کی زد میں آ کر پہلے تو صاحبِ فراش ہوئے۔ سرجری کے لیے ایبٹ آباد تک کے ہسپتالوں کی یاترا کی

اور ڈاکٹروں کی ہدایات کے مطابق میڈیکل ریسٹ پر گئے۔ ٹانگ کی سرجری کوئی ایسی وجہ نہیں تھی جوان کے اس سفرِ حیات کو تمام کرتی۔

یقین تھا کہ وہ اگلے چند ہفتوں میں صحت یاب ہو کر دوبارہ تدریسی ٹیم کا حصہ ہوں گے۔ خود بھی اس معاملہ میں بہت پرعزم تھے کہ میں ایک بار چلنے پھرنے کی پوزیشن میں آجاؤں تو کالج حاضر ہوں گا مگر کیا کہیں ان کے اس دل کا جو چلتے چلتے اچانک ہی دھڑکنا بھول بیٹھا۔ وہ بشیر عباسی جس نے اگلے چند دن میں کالج آنا تھا، بظاہر معمولی سی دل کی تکلیف پر ہسپتال پہنچا مگر وہاں چند ساعتیں بھی نہ گزار سکا اور دائمی سفر پر روانہ ہو گیا۔ صبح کی اولین ساعتوں میں جب سب اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر جا رہے تھے اور کالج کھل رہے تھے کہ یہ روح فرسا خبر موبائل سکرین پر نمودار ہوئی کہ بشیر عباسی اب ہم میں نہیں رہے۔ حالانکہ وہ اب بھی ہم میں ہیں، ہمارے آس پاس ہیں، احساس بن کر خوبصورت یاد بن کر اور ہمیشہ ہمارے دلوں میں جگمگاتے رہیں گے۔

☆☆☆

میٹھے لوگ

ہم میں سے ہر ایک شخص دوسرے کو ضرورت کے وقت یاد آتا ہے اور اسی ضرورت کے حساب سے وہ دستیاب بھی ہوتا ہے۔ روزمرہ معمولات میں اپنے آس پاس نظر دوڑا کر دیکھ لیجیے آپ کو ہر شخص اپنی ضرورتوں کا اسیر ملے گا، جہاں ضرورت ختم وہاں ربط و تعلق ختم، جہاں ضرورت پڑ گئی وہاں پر ہر ایک رشتہ نکل آتا ہے۔ لیکن ایک ایسا شخص جو آپ کو ہر وقت اور ہر جگہ میسر ہو، ہر ایک کے لیے میسر ہو اور ہر ایک کے ساتھ یکساں میسر ہو تو وہ بلا مبالغہ سید شہباز گردیزی ہی ہو سکتا ہے۔ درمیانہ قد، گندمی رنگت، ڈاڑھی سے بھرا چہرہ، آنکھوں پر عینک سجائے شہباز کی شخصیت یک جہتی سے برعکس کثیر الجہت صفات سے مزین اپنے اندر کئی حوالے لیے ہوئے ہے۔

ہم میں سے ہر شخص اپنے لیے جیتا ہے، اپنے لیے ہی پیدا ہوتا اور اپنے دامن کو بھرتے بھرتے تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ شہباز گردیزی اس حوالے سے بھی ہم سب کی توقعات کے برعکس نکلا ہے۔ اس کی ذات کا ہر ایک حوالہ اسے دوسروں کے لیے جینے، دوسروں کو خوش کرنے، ان کی ضروریات کو پورا کرنے اور ان ضروریات کی تکمیل کے لیے سرگرداں نظر آتا ہے۔ اُس کے دوستوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہر ایک کا گمان ہے کہ وہ صرف اسی کا دوست ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ دوستوں کے درمیان وہ ایک ایسا مرکزہ ہے جس کی وجہ سے سب ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

شہباز کی خامی یہ ہے کہ اُسے انکار کرنا نہیں آتا کیونکہ بیچارہ مروت کا مارا ہے۔ لہذا کسی نے جو بھی کہہ دیا اسے قبول کرنا اس کی مجبوری بن جاتی ہے اگرچہ یہ وقتی ہاں اسے کتنی ہی اذیتوں سے دوچار کر دے اور اس ایک ہاں کا مارا کب تک اس ہاں کی اذیت میں مبتلا رہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ اگر مظفرآباد کسی مشاعرے

میں شرکت کے بعد واپس باغ پہنچا تو آگے کوئی اور دوست مل گیا جس نے کسی کام سے راولاکوٹ جانا تھا اس نے شہباز کو ساتھ لیا اور راولاکوٹ پہنچا دیا۔ وہاں سے واپسی پر اگر کسی اور نے حویلی نکلنا تھا تو یہ مروت کا مارا اس کا ہم سفر ٹھہرا۔ کسی نے شادی میں شرکت کرنا ہو یا نماز جنازہ میں جانا ہو شہباز کے بغیر یہ سفر نامکمل دکھائی دیتا ہے۔ یار لوگوں نے تو اس کی اس افتادِ طبع کو دیکھتے ہوئے اسے ٹیکسی کے لقب سے ملقب کر دیا جو ہر ایک کو ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔ مگر یہ بات بھی یار لوگ ہی جانتے ہیں کہ وہ اپنے ہم جولیوں کے لیے کتنا اہم ہے اور اس کا ہر ایک کو یوں میسر ہونا کوئی آسان بات نہیں۔

یہ تو شہباز ہی جانتا ہے کہ اس نے اپنی اور گھر والوں کی کون سی خواہش اور کون سی ضرورت کو قربان کر کے خود کو دوسروں کے لیے دستیاب کیا ہے۔ گویا اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جو بظاہر نظر نہیں آتی مگر جس کی عدم موجودگی انسانوں سے جینے کا جواز چھین لیتی ہے یا پھر بظاہر معمولی سا نظر آنے والا نمک جس کا ظاہری وجود اگرچہ بہت تھوڑا ہوتا ہے مگر اس کی عدم دستیابی ہر ایک کھانے کو بے لذت کر کے رکھ دیتی ہے۔ شہباز کا ظاہری وجود بھی ایسا ہی ہے جس کی بظاہر موجودگی معمولی سی ہے مگر اس کی عدم موجودگی اس کے وجود کے خلا کو پُر نہیں کر سکتی۔

اس کے پاس ظاہری اعتبار سے بڑی ڈگریاں نہیں ہیں مگر جو بصیرت اس کے پاس ہے بہت سے ڈگریوں والے بھی اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ بہت سے ڈگریوں کے خواہشمند اپنی ڈگری کے حصول کے لیے شہباز کی فکر و فن کے محتاج ہیں اس پر تحقیق کرنا اپنے لیے اعزاز سمجھتے اور اس کے فکر و فن پر تحقیق کر کے ڈگریوں کے حقدار بنتے ہیں تو بے جا نہیں۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دوسرے اہلِ علم و فن اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے اور میرے نزدیک اس کا تعلق کثرت اور برکت کے فارمولے سے ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے ایسے اہلِ فن و کمال موجود ہیں جو کثیر الاعیال ہونے کے ساتھ ساتھ کثیر التصانیف بھی ہیں اور اپنی اس کثرت پر اتراتے پھرتے ہیں مگر وہ اس برکت سے محروم ہیں جو شہباز کی گنتی کی چند تصانیف کو حاصل ہے اور جس کی وجہ سے وہ اپنے ہم عصروں میں ممیّز و ممتاز ہے۔ 'حقیقتوں کے عذاب'، 'خواب کون دیکھے گا'، 'جمہوریت کی دیوی'، 'اُجلی مٹی'، متاعِ حسن'، اور 'ضمیر باضمیر'

میرے اس دعوے کے وہ دستاویزی ثبوت ہیں جو ہر ایک کو ہر وقت دستیاب ہیں۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ تخلیق کاروں کے ہاں ذاتی نظم وضبط کے برعکس ساری توجہ تخلیق پر مرکوز ہوتی ہے جس کی وجہ سے ذاتی زندگی میں نظم متاثر نظر آتا ہے۔ان کی شخصیت سے لے کر اُن کے گھر اور کمرے تک حسنِ ترتیب کے برعکس حزنِ ترتیب دکھائی دیتا ہے۔شہباز اس معاملے میں بھی اپنے پیشروؤں کے برعکس مربوط و منظّم ہے۔وہ جو سوچتا اور جیسے سوچتا ہے اور جو تحریر کرتا ہے جیسے تحریر کرتا ہے وہ سب اس کے پاس خاص حسن ترتیب سے مزین اور موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس سے جب اور جہاں کسی چیز کی ضرورت پڑے وہ اسے فوراً لا حاضر کرتا ہے۔

طلوع ادب کی ستائیس سالہ ادبی تاریخ میں شہباز کی طلوع ادب کے ساتھ وابستگی لگ بھگ پچیس سالوں پر محیط ہے۔اس سارے عرصہ میں طلوع ادب کی ہر ایک نشست اور ہر ایک سرگرمی کی تفصیل تاریخ وار اس کے پاس مرقوم ہے۔جب بھی تحقیقی حوالے سے کسی یونیورسٹی یا کسی محقق کو تحقیقی نقطہ نظر سے مواد کی ضرورت پیش آئی شہباز گردیزی اس کا پہلا اور آخری انتخاب ٹھہرا۔ہر موقع پر اس نے اپنی اس خوبی سے سب کو متاثر کیا ہے۔ادبی تنظیموں کے حوالے سے لکھے گئے مقالات ہوں یا طلوع ادب پر تحقیقی مقالہ جات،کسی شاعر،ادیب دوست پر تحقیقی کام کے حوالے سے مواد کی ضرورت ہو یا طلوع ادب کے نمائندہ مجلّہ مطلع کے حوالے سے کوئی مواد درکار ہو شہباز کے بغیر یہ مکمل ہی نہیں ہوتا۔شہباز کی اس مرحلہ پر بھی یہ خوبی ہے کہ وہ یہ سب کچھ کر کے بھی خود کہیں نظر نہیں آ رہا ہوتا۔۔۔۔

شہباز کی پرواز شاید آج بھی سندھ حیدرآباد میں کسی واپڈا ہاؤس میں ہو رہی ہوتی اگر حالات اسے سندھ سے اُٹھا کر کشمیر نہ لاتے اور وہ تعلیمی پیکج کے زیر اثر آزاد کشمیر کے محکمہ ہائر ایجوکیشن کا حصہ نہ بنتا۔میرا ذاتی خیال ہے کہ حالات نے اسے ٹھیک ہی حیدرآباد اور واپڈا سے اُٹھا کر آزاد کشمیر تک پہنچایا۔ اسے یہ حالات باہم پہنچائے جن سے گزر کر وہ شہباز شاہ سے سید شہباز گردیزی کے مرتبے تک پہنچا۔بلا شبہ فطرت خود کرتی ہے لالے کی حنا بندی......اور فطرت ہر حال میں اپنے مقاصد پورے کر کے رہتی ہے اس کے لیے چاہے کسی تعمیر کے عمل کی ضرورت پڑے یا پھر تخریب سے گزر کر اسے اپنے مقاصد تک پہنچائے۔

جس عہدے پر شہباز کام کر رہا ہے میں نے اپنے زمانہ طالب علمی سے پیشہ وارانہ زندگی کے اس سارے عرصہ میں کسی کالج میں کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو ہفتے کے چھ دن، مہینے کے 25 یا 26 دن اور سال کے بارہ مہینوں کے تمام کام کے دنوں میں کالج آتا ہو، پورے چھ گھنٹے کالج میں گزارتا ہو اور یہ ترتیب اور مشق صرف ایک دن یا ایک ہفتے کی نہیں پورے پچیس سالوں پر مشتمل ہو اور بلاشبہ اس عہدے پر اس طرح باقاعدہ کام کرنے والے صرف شہباز گردیزی ہی ہو سکتا ہے میرا تو اس اسامی کے حوالے سے ہمیشہ سے ہی یہ تصور رہا کہ محکمہ تعلیم والوں نے آخر کیا سوچ کر یہ اسامی تخلیق کی ہو گی اور اس اسامی کی ضرورت کیوں پیش آئی ہو گی جس پر کام کرنے والے کبھی نہ تو باقاعدہ حاضر ہوئے نہ ہی اپنی اسامی کے پیشہ وارانہ فرائض سرانجام دیے۔ آج بائیو میٹرک حاضری کے دور میں بھی یہ لوگ باقاعدہ کالج نہیں آتے۔ اب ذرا خود تصور کر لیں کہ جب کالجوں میں باقاعدہ حاضری کا تصور نہیں تھا تب یہ لوگ سال کے کتنے دن اپنے اپنے اداروں میں جاتے رہے ہوں گے۔

شہباز اس حوالے سے قابل تعریف ہے کہ اس نے اس اسامی پر رہتے ہوئے اس کی موجودگی کا احساس دلایا۔ وہ بیک وقت اس اسامی پر اپنی متعلقہ لیبارٹری کا نظم و نسق بھی قائم کرتا ہے، پریکٹیکل کے سامان کو یقینی بناتا ہے بلکہ اکثر اوقات سارے پریکٹیکل بھی خود ہی کرواتا ہے۔ اس پر مزید غضب یہ کہ عموماً کالجوں میں سائنس کے ہر شعبہ حیاتیات، کیمیا اور طبعیات کے الگ الگ استاد اور لیبارٹری اسسٹنٹ موجود ہوتے ہیں مگر جہاں شہباز تعینات ہے وہاں ان تمام شعبہ جات کا اکلوتا وارث ہے۔ ایک ایسا لیبارٹری اسسٹنٹ جس کی پیشہ وارانہ بصارت اور بصیرت کے سامنے اساتذہ اور طلبہ سب مشت خاک ہیں۔

وہ صرف کالج ہی نہیں جاتا باقاعدگی سے تدریسی عمل کا حصہ بھی بنتا ہے۔ اس کی پیشہ وارانہ اہمیت اساتذہ اور طلبہ دونوں کے سامنے مسلمہ ہے ہی انتظامیہ بھی کسب فیض کمانے میں بخل سے کام نہیں لیتی۔ لہذا وہ انتظامی معاملات میں بھی باقاعدگی سے اسی طرح فعال کردار ادا کرتا نظر آتا ہے جیسا اپنی لیبارٹری میں پیش پیش ہوتا ہے۔ نصابی اور ہم نصابی سرگرمیاں اس کی شمولیت کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو پاتی۔ بلکہ حد تو یہ ہے کہ بقول مشتاق یوسفی ''ہر گھر کا ایک چہرہ ہوتا ہے جس سے اُس گھر کی پہچان ہوتی ہے۔'' اس حوالے سے شہباز کی

پہچان اس کے کالج کے حوالے سے اپنی جگہ یہاں تو شہباز گردیزی کے حوالے سے اس کا کالج پہچانا جاتا ہے۔

کسی بھی تعلیمی ادارے میں کوئی مقابلہ ہو شہباز کی موجودگی کے بغیر اس کی منصفی نامکمل ہوتی ہے اور جس تقریری مقابلہ یا مباحثہ میں شہباز جج ہو اس کے معیار انصاف اور نتائج پر مہر تصدیق ہوتی ہے۔ کتنی ہی تنظیموں کا اعزاز سرپرستی اس کے پاس ہے مگر حیرت ہے کہ اس سے اس کی طبعیت پر کوئی فرق پڑا ہو۔ وہ جیسا تھا ویسا ہی ہے اپنے پرائے سب کے لیے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو اس سے روزانہ کی بنیاد پر تقریری لکھواتے، تحریری لکھواتے اور اپنے نام سے شائع اور استعمال کرتے ہیں۔ کتنی ہی گھر ایسے ہیں جہاں اگر کوئی نومولود دنیا میں وارد ہوا ہو اور انھوں نے شہباز گردیزی سے کسب فیض حاصل نہ کیا ہو اور اس کا نام شہباز نے نہ دیا ہو۔ کتنے ہی نو آموز ایسے ہیں جو شہباز گردیزی کو اپنا مسیحا اور مرشد مانتے ہوئے اس کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہ کرتے ہوں۔ یہ سب کچھ وہ خوشی خوشی کرتا ہے، اس کے ماتھے پر شکن نہیں آتی۔ وہ کسی سے بیر نہیں رکھتا، اس کی کسی سے دشمنی نہیں، وہ کسی سے نفرت نہیں کرتا، اس کے دل میں کسی کے لیے کینہ نہیں۔

مذہب کے معاملے میں وہ آفاقیت پر یقین رکھتا ہے، صلح کل کا قائل ہے، جز کے مقابلے میں کُل کو ترجیح دیتا ہے۔ فتویٰ کے مقابلے میں اجماع کو مانتا ہے، اپنی مذہبیت کا پرچار نہیں کرتا۔ اس کا ماننا ہے کہ

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

انسانیت اس کا مذہب ہے، اس حوالے سے وہ انتہا کا مذہبی ہے۔ مگر اس حوالے سے بھی وہ کسی سے بے مقصد بحث نہیں کرتا نہ اپنی رائے دوسروں پر مسلط کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ہر معاملے میں اپنی الگ رائے رکھتا ہے اور عموماً اس کی رائے رائج الوقت آراء اور نظریات سے مختلف اور منفرد ہی ہوتی ہے۔

بعض احباب کی رائے ہے کہ اس کی شاعری اس کی نثر سے بڑھ کر ہے، بعض کا کہنا ہے کہ اس کی نثر اس کی شاعری سے عمدہ ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ وہ غزل سہولت سے کہتا ہے جبکہ بعض کے نزدیک وہ نظم کا شاعر ہے۔ یار لوگوں کا ماننا ہے کہ وہ دوستی میں بڑھ کر ہے جبکہ اس کے ساتھ کام کرنے والوں کا یہ ماننا ہے کہ وہ بہت اچھا پروفیشنل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظم ہو یا نثر، تاریخ ہو کہ تحقیق، تصنیف ہو یا تالیف، مقامی ادب ہو یا

انشاء پردازی کے نمونے اس کی ہر ایک چیز دوسری سے بڑھ کر ہے۔ وہ جتنے بھی کام کرتا ہے سہولت سے کرتا ہے۔ وہ یاری بھی نبھاتا ہے رشتہ داری بھی۔ روزگار سے وابستگی بھی پوری کرتا ہے اور سماجی زندگی کے تمام شعبہ جات میں بھی پیش پیش رہتا ہے اور یہ سب کچھ کر کے وہ اپنی ادبی، تحقیقی، تصنیفی اور تالیفی خدمات بھی پوری تندہی سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ آزاد کشمیر میں ضلع باغ اگر ادبی حوالے سے سرفہرست دکھائی دیتا ہے تو سید شہباز گردیزی اس ترتیب میں بلا مبالغہ سرفہرست ہے۔ اس کی فکر وفن اس کی زندگی میں مہمیز کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

اپنی زندگی کا نصف سے زائد عرصہ اسے ذیابیطس کے ساتھ لڑتے گزر گیا ہے اس وجہ سے اس کا شمار میٹھے لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ روزانہ دن میں تین بار سرنج کی سوئی سے اپنے بدن کو چھید کرتا اور بدن میں انسولین اتارتا ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ عمر کے ایک خاص حصے میں پہنچ کر بہت سے لوگ ذیابیطس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جو ایک بار اس میں مبتلا ہو جائے وہ اس کو اس طرح خود پر طاری کرتا ہے کہ بمشکل چند سال ہی جی پاتا ہے۔ اس معاملے میں بھی شہباز گزشتہ پچیس سالوں سے نبرد آزما ہے۔ اس نے اس بیماری کے سامنے ہار ماننے کی بجائے ''میٹھے لوگ'' کے نام سے انجمن بنا ڈالی تا کہ عوام الناس کی فلاح و بہبود ممکن بنائی جا سکے۔ اس کا ماننا ہے کہ

اس اک بات پر اٹکی ہوئی ہے سانس مری
میں مر گیا تو میرے خواب کون دیکھے گا

لہذا وہ ضد پر اڑا ہوا ہے وہ روزانہ خواب دیکھتا ہے پھر ان خوابوں کی تعبیر کے لیے مصروف عمل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر ایک پل میں جیتا ہے اور ہر ایک پل میں جینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے نام کے مصداق ہمیشہ بلند پروازی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ یہ آنے والے وقت کے مورخ نے فیصلہ کرنا ہے کہ اس کی بلند پروازی کی آخری حد کون سی ہے۔

☆☆☆

سرفراز دھوکا نہیں دیتا

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں یہاں دوسروں کے ساتھ تعلقات تین صورتوں میں استوار کیے جاتے ہیں یا تو نفرت پر مبنی یا کوئی غرض و مفادات یا پھر کسی کی ذات اگر ہمارے دل میں اتر جائے ، ورنہ تو ہر روز ہمارے آس پاس سینکڑوں ، ہزاروں لوگ آجا رہے ہوتے ہیں مگر ہم ان کے لیے اور وہ ہمارے لیے اجنبی رہتے ہیں۔ دوسروں کو پاس لانے یا دور لے جانے میں ان سے زیادہ انسان کا اپنا بڑا کردار ہوتا ہے جس سے کبھی تو وہ دوسرے کے دل میں اتر جاتا ہے تو کبھی دل سے اتر جاتا ہے۔ یہ اس کی باتیں ہی ہوتی ہیں جو کہیں تو دوسرے کا دل جیت لیتی ہیں تو کہیں دل چیر دیتی ہیں۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ انسان صرف رتبوں اور عہدوں سے بڑا نہیں بنتا نہ ہی ہر دلعزیز۔ بقول ممتاز مفتی: ''میں نے بڑے بڑے رتبوں پر چھوٹے چھوٹے آدمی دیکھے ہیں اور چھوٹی چھوٹی جگہوں پر بڑے بڑے انسان''۔ اگر ہم اپنی کھلی آنکھوں سے اپنے آس پاس دیکھیں تو آپ کو میرے اس دعوے کی تصدیق ہو جائے گی۔ ایسے لوگ آندھی اور طوفان کی طرح نہیں ہوتے جو پل بھر میں سب کچھ اُلٹ پلٹ کر رکھ دیں۔ یہ تو بس اس آکسیجن کی مانند ہوتے ہیں جو دکھائی نہیں دیتی مگر اس کی عدم موجودگی سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے یا پھر کھانے میں نمک کی مانند جو نظر نہ آتے ہوئے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے اور اس کی عدم موجودگی کھانے کی طرح زندگی کو بھی بے مزا بنا دیتی ہے۔

ذرا غور کریں کتنے ہی لوگ تھے جو کبھی ہمارے لیے کتنے اہم تھے مگر آج شاید ہمیں ٹھیک طور پر ان کا

نام ان کا چہرہ تک یادنہیں۔سکول، کالج کی زندگی میں کتنے اساتذہ، ہم جماعت آج ہمیں یاد ہیں، مگر انہی سینکڑوں ہزاروں میں سے چند ایک ایسے ہیں جو کبھی ہمارے دل و دماغ سے اتر ہی نہیں سکے۔ یہ کمال کس کا ہے ہمارا یا پھر ان کا جو ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود کبھی بھولتے ہی نہیں

سال ۲۰۱۰ء کی بات ہے پرل ویلی پوسٹ گریجویٹ کالج باغ میں ایڈمن کی پوسٹ پر راولاکوٹ سے ایک عام سا سیدھا سادہ نوجوان تعینات ہوا۔ بظاہر معمولی شکل وصورت، میانہ قدم دبلا جسم، چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی، بڑی سی چمکدار آنکھیں عموماً پینٹ شرٹ میں ملبوس اور جمعہ کو ہمیشہ سفید شلوار زیب تن کیے اپنے دیگر ممبران سٹاف سے مختلف اور منفرد دکھائی دینے والا سرفراز احمد۔ جملہ سٹاف سے اس کا تعلق واجبی سا تھا، میرا اس کا تعلق بھی ابتدا میں صرف ضرورت کی حد تک تھا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب اس کے اور میرے درمیان یہ واجبی سا تعلق پیشہ وارانہ امور سے نکل کر ذاتی تعلقات تک آ گیا ہے۔ میں نے لوگوں کو عموماً بڑی بڑی باتیں کرتے دیکھا ہے، اُن کے پاس بڑے بڑے خواب ہوتے ہیں مگر جب بھی ہم آپس میں مل بیٹھے اُس کے پاس چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی، چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے چھوٹے خواب۔ شاید اُسے بڑی بڑی باتیں کرنا آتی ہی نہیں تھی۔

جب تک اس کے ابا جان بیمار رہے اسے ہمیشہ اُن کی بیماری اور علاج کی فکر دامن گیر رہتی، جب وہ نہ رہے تو ایسے لگتا تھا اس کا سب کچھ چھن گیا ہے......مگر اسے اپنی محرومیوں کا اظہار کرنا نہیں آتا تھا۔ ہر طرح کے احساسات سے عاری سپاٹ چہرہ......مگر اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ بے حس تھا......وہ بہت حساس تھا، ہر بات میں ہر معاملہ میں......اپنے باپ کا غم اسے دیمک کی طرح اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا جس کے آثار وہ اپنے چہرے سے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ کبھی زبان پر کوئی حرف شکایت نہ لاتا جس سے سامنے والا اس کے اندر گزرنے والے کرب کا اندازہ کرسکتا۔ اسے اپنی ماں کی ہمیشہ بہت فکر رہتی، اپنے بھائی کی جو نا کافی تنخواہ، سیلری ایڈوانس اور ازدواجی ناہمواریوں کی گرداب میں تھا، اپنے بہن بھائیوں کے مستقبل کی اور ان سب سے بڑھ کر اپنے لیے روزگار کے کسی ایسے الہٰ دین کے چراغ کے ''جنّ'' کی جس کی مدد سے اپنی ذات سے وابستہ لوگوں کی خوشیاں خرید سکتا۔

بوتل کے ''جن'' کو قابو کرنے کا گُر کسی نے یا پھر زندگی نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا سو گریجویشن کر کے آنے والی اس ننھی سی جان نے محنت اور ریاضت سے اسے قابو میں کرنے کے لیے پہلے ایم کام کیا، پھر بی ایڈ، ایم ایڈ اور اب ایم ایس کی تکمیل کر کے اسے یقین تھا کہ وہ اسے ہر حال میں قابو میں کر لے گا مگر اس کی ریاضت اور چِلّہ ایم ایس کے پہلے سمسٹر کے بعد ہی ٹوٹ گیا۔ مجھے پتا تھا کہ اس کے وسائل اسے ان سب باتوں کی اجازت نہیں دیتے دوسرے یہ کہ وہ بہت خوددار تھا، بھوکا پیاسا رہ لیتا مگر اپنی ضرورت دوسروں سے کبھی بیان نہ کرتا۔ اس کے باوجود جانے کیوں اسے یقین تھا جیسے وہ یہ سب کچھ حاصل کر لے گا۔

مجھے کسی ذریعے سے پتہ چلا کہ اس کے پاس دوسرے سمسٹر کی فیس نہیں اس لیے وہ ایم ایس کا سفر ادھورا چھوڑ رہا ہے۔ میں نے مظفرآباد سے اپنے اور اس کے ایک مشترکہ دوست کو فون کر کے صورت حال بتائی تو اس نے کہا کہ میرا ایک دوست بیت المال میں ہے اس سے بات کر کے اس کی ساری فیس بیت المال سے منظور کراتے ہیں۔ ساری بات مکمل ہو جانے کے بعد جب میں نے اسے فون کر کے بتایا کہ میں نے ساری بات کر لی ہے تم اپنے کاغذات سمیت میرے دوست سے ملو اور اپنا مسئلہ حل کراؤ۔ اس پر وہ کہنے لگا آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میرا فیس کا مسئلہ ہے؟ میں نے بتایا کہ جس سے دوستی ہو اس کی خبر بھی رکھی جاتی ہے۔ کہنے لگا ابھی میں نے بندوبست کر لیا ہے آپ اس سے کسی اور کی مدد کر دیں اس کا بھلا ہو جائے گا۔

وہ بامروت اتنا تھا کہ کسی کا دل نہیں توڑ سکتا تھا ہر بات خود پر سہہ لیتا مگر دوسروں کو تکلیف نہ دیتا۔ انکار کرنا تو اسے آتا ہی نہیں تھا، ہر دکھ ہر درد اپنے سینے میں سمو لیتا۔ نہ نہ کرنے کی وجہ سے اسے کتنی مشکلات برداشت کرنا پڑ رہی تھیں یہ میں خوب جانتا تھا۔ بہتر روزگار اس کی اولین ضرورت تھی اور اسے اس کے متعدد مواقع بھی میسر آئے مگر اس کالج کی یہ چھوٹی سی نوکری چھوڑنے کے لیے 'نہ' کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ کالج میں ناکافی تنخواہ کے پیشِ نظر اس نے ایم ٹی بی سی میں روزگار کے لیے اپلائی کیا۔ تعلیم ایم کام تھی تجربہ اتنا تھا جو کسی بھی دفتر میں کام کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ سو اسے ایم ٹی بی سی سے فوراً انٹرویو کے لیے کال آ گئی اور رسمی دفتری کارروائی کے بعد روزگار کے لیے منتخب بھی کر لیا گیا۔

اب مرحلہ کالج انتظامیہ کو آگاہ کرنے اور وہاں سے باضابطہ طور پر استعفیٰ کا تھا۔ اتنی ہمت کہاں سے

لاتا جوان کو آگاہ کر کے نئی جگہ روزگار شروع کرتا۔ پھر بھی بہت سوچ بچار کے بعد ڈرتے ڈرتے ایم ڈی ادارہ سے اپنی مالی ضرورتوں اور نئی نوکری کے بارے میں آگاہ کر کے موجودہ نوکری چھوڑنے کی بات کی تو ایم ڈی ادارہ نے اسے منع کر دیا کہ ہم تمہیں یہیں بہتر معاوضہ دیں گے تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ سرفراز کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا دوسرے اپنی عادت بھی آڑے آ رہی تھی اس لیے چپ ہی رہنا پڑ گیا۔ وجہ صاف ظاہر تھی کہ وہ بس دوسروں کو خوش دیکھنا چاہتا تھا سب کا دل رکھ لیتا، ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتا اپنی اور اپنی ذات کی نفی کر دیتا۔ میں جب بھی دفتر میں آتا تو اپنے دفتر سے اُٹھ کر مجھے ملنے پرنسپل آفس آتا۔ اس طرح عزت دیتا جیسے راستے میں بچھ رہا ہو، ہمیشہ مودب رہتا اور جب میں جانا چاہتا تو کئی بار باہر تک ساتھ چھوڑنے آتا۔

وہ رشتے میں اپنے گھر میں چھوٹا تھا مگر جس طرح کے اس کے گھر کے حالات تھے اور جس طرح کے معاشی مسائل کا اس کے گھر کو سامنا تھا وہ چھوٹا ہوتے ہوئے بھی اس گھر کا بڑا تھا جس کے ناتواں کندھوں پر ہر طرح کا بوجھ تھا۔ اور وہ اپنی دھن کا ایسا پکا کہ ذرا سی جان اور اتنی سی ناتواں تنخواہ لیتے ہوئے گھر میں سب کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ سب کچھ سنبھال لے گا۔ بڑے بھائی کا سیلری ایڈوانس کٹ جانے کی وجہ سے تنخواہ میں جو کٹ لگ رہا تھا اس کو بھی سنبھال لے گا۔ گھریلو اخراجات کی بھی کسی کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ والدہ کی بیماری میں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں وہ ان کی تشخیص اور ادویات کے تمام اخراجات برداشت کر لے گا۔ غرض جس کا جو بھی مسئلہ ہے وہ بس یہ سوچ لے کہ سرفراز ہے ناں۔ اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ سب ہو گا کیسا اس کا خود اس کو بھی پتہ نہیں تھا۔ اگر پتہ تھا تو بس یہی کہ وہ کسی کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں انکار اس کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا۔

کالج میں اس کی تعیناتی بطور ایڈمن ہوئی مگر تھوڑے ہی عرصہ میں سارا کالج اس کی ذات بن گئی۔ ہمہ تن کام میں لگے رہنا، ایک نہیں لگا تار کئی کئی کلاسیں پڑھانا، دفتر کے سارے امور، یونیورسٹیوں سے خط کتابت، سٹوڈنٹ افیئرز، ہر ایک کام میں دوسرے سے بڑھ کر کارکردگی دکھانا ریکارڈ رکھنا۔ ان سب باتوں کا معاوضہ اگر ہزاروں روپوں کی صورت میں بھی اسے دیا جاتا تو کم تھا۔ شام کو جب تھکا ہارا اپنے کمرے میں جاتا تو اپنی تعلیم، اپنا مستقبل، اپنی محرومیاں، تلخیاں کچھ اس طرح آ کر گھیر تیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں بقول شاعر

بے تابیاں سمیٹ کر سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو میرا دل بنا دیا

میرا ایک دوست جب بھی کسی سے ملتا ہے تو ایک سوال ضرور پوچھتا ہے کہ: ''سنائیں آپ کا دل کیسا ہے؟'' مجھے اس سوال کی گہرائی کا کبھی اندازہ نہ ہوا مگر جب یہ خبر ہوئی کہ سرفراز بہت سی امنگیں، خواب، جذبے اور تلخیاں لیے ہوئے دل کو ہی بیمار کر بیٹھا تو اندازہ ہوا کہ ہم ایک دوسرے کے ظاہری حال احوال تو پوچھتے ہی ہیں مگر اس کے دل کے حال احوال کا ہمیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کا دل مختصر سے عرصہ میں اب اس مقام تک آ پہنچا ہے کہ جہاں وہ زیادہ دیر تک اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کا دل کب سے اس حال میں تھا ہم میں سے کسی کو بھی اس کی خبر نہیں تھی۔ ہمارے نزدیک اس کے دل کا عارضہ محض وقتی کسی پیچیدگی کے باعث ہے جو جلد علاج سے صحت یاب ہو جائے گا مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ عمر کے اعتبار سے اپنے بہن بھائیوں میں بھی کم عمر اور عین نوجوانی میں اس کا مرض اس قدر آگے چلا جائے گا جہاں سے واپسی کی کوئی صورت نہیں ہوگی یہ ہم میں سے کسی نے نہیں سوچا تھا۔

رحلت سے ایک دن قبل میں حسب معمول کالج گیا تو بہت تپاک سے آ کر ملا۔ خود چائے کا آرڈر دے کر آیا، بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے کہنے لگا: سر آپ کو ہمیشہ میرے دل کی فکر رہتی تھی ناں، سو میں پرسوں سائیں جاوید کے پاس گیا تھا اور اس سے روحانی آپریشن کرا آیا ہوں۔ اب میرا دل ٹھیک ہو جائے گا، لیکن سر اُس نے کھانے کے لیے ایک پھکی بھی دی ہوئی ہے میں جب اسے استعمال کرتا ہوں تو بہت تکلیف ہوتی ہے لگتا ہے میں نہیں بچوں گا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس قدر تکلیف میں ہے اور اس کی یہ بات چوبیس گھنٹے میں ہی پوری ہو جائے گی۔

اگلے دن شام کے لگ بھگ جب مجھے کالج کے ایک طالب علم کی طرف سے اس کی موت کی خبر ملی تو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اتنی جلدی کوئی کسی سے اس طرح جدا ہو سکتا ہے، کیا ایسے کوئی چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ اس شہر میں صرف میں ہی اس کا دوست ہوں جس سے وہ اپنا ہر دکھ سکھ بیان کرتا ہے۔ مگر جب اس کے جنازے پر ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ اس کے تعلقات، حسن سلوک اور رفاقت

کے تذکرے سنے تو سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس شہر میں کوئی ایسا بھی ہے جو اس کا دوست اور خیر خواہ نہ ہو۔ ایک ایسا انسان جو محض روزگار کے لیے اپنے شہر سے دوسرے شہر آیا ہو، جس کے پاس کوئی معقول روزگار ہے نہ معقول آمدن مگر اس کے باوجود وہ ہر ایک کے ساتھ کم ترین وسائل کے باوجود پوری طرح تعاون کرنے والا اوران کے دکھ سکھ کو بانٹنے والا، یقیناً یہ سرفراز ہی ہوسکتا ہے۔

ہم جب بھی کسی کے جنازے میں شرکت یا تعزیت پر جاتے ہیں تو لوگ رسماً کہتے ہیں کہ مرحوم بہت اچھے انسان تھے حالانکہ وہ جان رہے ہوتے ہیں کہ مرحوم زمین کا بوجھ تھے اور دھرتی ان سے تنگ تھی۔ ہمارے آس پاس ہزاروں لوگ مرتے ہیں سوائے ان سے وابستہ لوگوں کے کسی کو صحیح معنوں میں کسی کی موت کا دکھ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جنازہ گاہ اور قبروں پر بیٹھ کر بھی سیاست بازی اور دنیاداری کی باتیں کرتے ہیں۔ ہمیں کسی کی موت متاثر نہیں کرتی مگر ایک ایسا انسان جس کی اچھائی کی اپنے بیگانے سب گواہی دے رہے ہوں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ جس کی موت اپنے بیگانے سب کو ہلا کر رکھ دے کم کم ہوتا ہے، جس کا صدمہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہوا محسوس ہو وہ یقیناً سرفراز احمد ہی ہوسکتا ہے جو مر تو سکتا ہے کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ بلاشبہ ایسی موت کسی کسی کے نصیب میں ہوتی ہے۔

☆☆☆

خوش جمال وخوش خصال

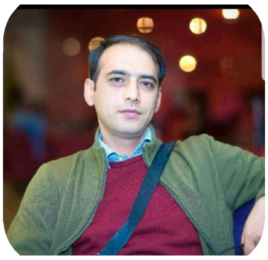

چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں سلسلہ وار
میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے
اچانک ایک ستارہ فلک سے ٹوٹ گیا
مرے بھی شامل بزم شبانہ ہوتے ہوئے

ہم جس چہرے کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں وہ ہمارا اپنا نہیں ہوتا بلکہ وہ ہوتا ہے جو ہمارے والدین ہمیں عطا کرتے ہیں مگر ہم جس چہرے کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں وہ وہی چہرہ ہوتا ہے جسے ہم عمر بھر اپنے کردار سے تراشتے رہتے ہیں اور وہی ہماری آخری پہچان بنتا ہے بقول مشتاق یوسفی: ہر گھر کا ایک چہرہ ہوتا ہے جس سے اُس گھر کی پہچان ہوتی ہے۔ کامران بٹ بھی ایسا ہی ایک چہرہ تھا جس کا دنیا میں آنا ایک معمول کی بات تھی مگر جس کا رخصت ہونا اس گھر، اس شہر اور اس خطہ کی پہچان کا رخصت ہونا ہے۔ وہ بلاشبہ اپنے گھر کا، اپنے خاندان کا اور اس باغ کا وہ خوش جمال، خوش خصال، خوش خیال اور خوش کمال چہرہ تھا جس سے اس کے گھر، اس کے خاندان اور اس شہر کی پہچان تھی۔

ہماری اور کامران بٹ کی رفاقت ریل کی اُن بوگیوں کی سی تھی جو تمام سفر ایک دوسری کے ساتھ باہم متصل کاٹتی ہیں مگر آپس میں ملتی نہیں یا پھر دریا کے وہ دو کنارے جو ساتھ ساتھ بہتے تو ہیں مگر باہم متصل ہوتے ہوئے جدا جدا۔ کالج دور سے عملی زندگی کے اس سارے سفر میں یوں ہی ہم آگے پیچھے چلتے رہے۔ باہم ملے ہوئے مگر جدا جدا، ہماری انفرادیت ہمیں کارِ ملازمت کی طرف لے گئی تو کامران بٹ کی کارِ سیاست سے کارِ ہجرت اور کارِ مسافرت کی طرف۔ سو یوں ہم عمر بھر ''قیدِ مقام'' کے باسی ہو کر رہ گئے اور بقول ہمارے ایک راولاکوٹی ماسیر کے ''میں دنیا نے ہر کونے وچ گیا اس، لہور، پشور، کرنچی، سیالکوٹ لیکن میں ہور نہ میرہ اپنی بوبیا

نے کبھی آج تک نیس گیا(کہ میں نے ساری دنیا کی مسافت کی، لاہور، پشاور، کراچی، سیالکوٹ گیا لیکن اپنی پھوپھی کے گھر ہورنہ میرہ آج تک نہیں گیا ہوں)۔سو ہم ہورنہ میرہ سے پرے نہیں جا سکے اور کامران بٹ نے اپنے اس سفرِ حیات میں لگ بھگ سارے ہی براعظموں کی مساحرت کر لی۔

اس کی ہماری مماثلتوں میں جہاں ایک طرف ایک ہی کالج کے درو دیوار اور اس میں گزرے ہوئے چند سال ٹھہرے تو وہیں دوسری مماثلت ایک ہی کشتی کے اس مسافر والی جو اس کے اور ہمارے بزرگوں کی اس پار سے اس پار ہجرت پر منتج ہوئی۔ البتہ اس کے ہمارے درمیان جو چیز فرق ڈالنے والی تھی وہ یہ کہ ہم ٹھہرے ذرا پڑھاکو طبعیت کے اور صرف کلاس، لائبریری، گراؤنڈ اور کیفے ٹیریا پر آ کر ہماری ساری یاترا مکمل ہو جاتی اس کے برعکس کامران بٹ کی نصاب سے زیادہ غیر نصابی سرگرمیوں پر آ کر تان ٹوٹتی۔ اسی طرح ہمارا دورِ طالب علمی دراصل دورِ گمنامی میں گزرا جس کا کل حاصل سیشن کے اختتام پر حاصل ہونے والا رزلٹ کارڈ یا پھر لائبریری کارڈ پر درج درجنوں کتابوں کی شکل میں باقی رہ جانے والا کارڈ ٹھہرا جبکہ کامران بٹ کا ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہوئی شہرت کی بلندیوں کو چھوتا ہوا مستقبل......

کامران بٹ اگر کسی ترقی یافتہ معاشرے کا فرد ہوتا تو کارِ سیاست میں اپنی انفرادیت کے جھنڈے گاڑنے کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کو بھی اپنے شخصی اوصاف سے ممیّز و ممتاز کر کے جاتا مگر بدقسمتی سے ہم جس معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں یہ سیاسی حوالے سے بھی اُتنا ہی بانجھ ہے جتنا سماجی و معاشرتی حوالے سے بانجھ ہے۔ ایسے ہی سماج کے متعلق ایک پرانی کہانی ہے کہ کسی جنگل میں ایک بندر رہتا تھا۔ اُس کی خواہش یہ تھی کہ جنگل میں اس کے مدمقابل کوئی اور بندر نہ ہو اور ساری بندریاں اُس کی ملکیت ہوں اور وہ جی بھر کر ان سے لطف اندوز ہوتا رہے لہذا وہ پیدا ہونے والے ہر بندر کو بانجھ کر دیتا اور تمام بندریوں پر اپنی حکمرانی کرنا۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ بندر بوڑھا ہو گیا۔ اب جنگل میں ہر طرف بندریاں ہی بندریاں تھیں جو نہ خود چین سے جیتی تھی نہ اُس بندر کو جینے دیتی تھی جبکہ بندر کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے کسی کام کا تھا نہ کسی اور کے کام کا۔ کچھ ایسا ہی حال آج بطور قوم اپنے آس پاس دیکھتے ہیں کہ ہم نے بنیادی نرسری طلبہ یونین سے ہی اصل سیاسی کارکنوں کو معاشرے میں پروان چڑھنے ہی نہیں دیا نیتجتاً بحیثیت مجموعی ہم قحط الرجال

کا شکار ہوکر رہ گئے اور اب ہر طرف بندریوں کا راج ہے۔

کامران بٹ ایک بھرپور سیاسی بصیرت و بصارت کا حامل اس خطہِ باغ کا وہ فرد اور وہ سیاسی کارکن تھا جو جب تک یہاں رہا یہاں کی کارزار سیاست میں اپنی خاص انفرادیت کے ساتھ موجود رہا۔ اپنی جماعت کے پلیٹ فارم سے اپنی جماعت کی طلبہ یونین کا صدر بنا، بعدازاں جب سردار قمرالزمان خان منصب وزارت پر فائز ہوئے تو وہ ان کے ساتھ بطور آفیسر تعلقات عامہ موجود رہا۔

بدلتے ہوئے منظر نامے میں اس کے پاس ممبر سینئر ایگزیکٹو کمیٹی اور صوبہ پنجاب کے چیف آرگنائزر کی ذمہ داریاں بھی رہیں۔ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج باغ اور بعدازاں گورڈن کالج راولپنڈی کا یہ طالب علم اپنے دور طالب علمی سے ہی کار سیاست میں متحرک اور نمایاں رہا۔ اس کی ان سرگرمیوں کا مرکز باغ کالج بھی رہا اور گورڈن کالج بھی، چنانچہ اپنے ان ایام کو بطور طالب علم رہنما کے ہمیشہ مرکزی رکھا کیوں کہ اسے دوسروں کے برعکس خود کو نمایاں رکھنے کا ہنر بخوبی آتا تھا۔

یہاں کے سیاسی منظر نامے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے عموماً جو خصوصیات درکار ہیں وہ حقیقت سے بہت دور اور غیر منطقی ہیں ان حالات میں کامران بٹ نے تمام صورت حال کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے دیارِ غیر کو اپنا اگلا مسکن بنایا تو وہاں یورپ میں بھی اپنی وطنیت، اپنی کشمیریت اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ اول اول پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے کشمیر کمیٹی کے وائس چیئرمین کے طور پر منتخب ہوئے، بعد ازاں اس کمیٹی سے مستعفی ہوکر جموں وکشمیر فورم کی بنیاد رکھی، اس کا منشور ترتیب دیا اور اس فورم کے بانی جنرل سیکرٹری کے طور پر کام کرتے رہے۔

جموں وکشمیر فورم کے کام کو دیکھتے ہوئے 2018ء میں اس نے ایک نئی تنظیم کی بنیاد رکھی جو آج بھی مشن کشمیر ٹاسک فورس کی شکل میں اپنا جداگانہ تشخص لیے ہوئے ہے۔ مشن کشمیر ٹاسک فورس کہنے کو کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کی تحریک کا ایک فورم تھا بالکل ویسا جیسا بہت سے فورم اور سیاسی جماعتیں ہمارے آس پاس بکھری پڑی ہیں۔ ایک خاص وقت میں یہ سیاسی جماعتیں اور فورم فعال ہوکر متحرک کردار ادا کرتے ہیں اور پھر پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ مسئلہ کشمیر کے آغاز اور تحریک جدوجہد آزادی کشمیر کے بالکل شروع سے آج تک

دیکھ لیجیے کتنی ہی سیاسی جماعتیں اور فورم ہمیں دکھائی اور سنائی دیتے ہیں جو ایک وقت میں بہت فعال تھے پھر قصہ ماضی ہو گئے۔

اس کے برعکس کامران بٹ جب تک موجود رہا اس نے اس فورم سے چاہے فرانس کی پارلیمنٹ ہو چاہے یورپی یونین کا پلیٹ فارم، چاہے خطہ باغ ہو چاہے پورا آزاد کشمیر اس فورم کو ہر جگہ متحرک رکھا۔ ہر جگہ اس فورم کے پلیٹ فارم سے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے آواز اُٹھائی۔ اس آواز کو ایوان انصاف کے متعدد فورمز اور انسانی حقوق کے ان اداروں تک پہنچایا جو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر اپنی آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کو بتایا کہ کشمیر صرف ایک جغرافیائی خطے کی تقسیم کا مسئلہ نہیں بلکہ ڈیڑھ کروڑ کشمیریوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اگر اس مسئلہ کے پائیدار اور غیر جانبدارانہ حل کی طرف توجہ نہ کی گئی تو یہ ایک ایسا آتش فشاں ہے جو چار ایٹمی قوتوں کے درمیان رہتے ہوئے کسی بھی وقت وہ صورت اختیار کر سکتا ہے جس سے ہونے والی تباہی کے اثرات صرف اس خطہ کے باسیوں تک نہیں رہیں گے بلکہ ساری دنیا کو متاثر کریں گے۔ یہ کامران بٹ کا وہ یادگار اور باقی رہ جانے والا کام ہے جو اسے اپنے ہم عصروں سے جدا کرتا ہے۔

عام مشاہدہ یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جو مصلحت کوشی کی زندگی گزار دیتے ہیں۔ اپنی ہر سوچ ہر خواہش کو سینے میں دبائے یہ سوچتے ہوئے کہ دوسرے کیا کہیں گے ہم وہ کام بھی نہیں کرتے جو ہماری خواہش ہوتے ہیں اور ضرورت بھی، مگر کامران بٹ اس معاملے میں بھی مصلحت پسندی کے مقابلے میں جو سوچا، جو چاہا اور جو من کو بہایا اُس کو کر گزرے یہ سوچے بغیر کہ دوسرے کیا کہیں گے۔ اس بات نے بھی اُنہیں اپنے ہم عصروں سے جدا کیا اور یوں وہ کثیر المال، کثیر البال اور کثیر الاعیال ٹھہرا۔

ہم میں سے اکثر کی آدھی زندگی عسرت میں گزرتی ہے اور آدھی حسرت میں مگر کامران بٹ اس معاملے میں سمجھوتا کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے مشکلات اور مصائب کو کبھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا اور نہ ہی زندگی میں کسی چیز کو حسرت بنا کر ساری زندگی ان حسرتوں کے مزار پر جوگی بن کر گزاری۔ اس نے جو چاہا جو اس کے من کو بھایا اس کو حاصل کیا اور مجھے یقین ہے جب وہ دنیا سے رخصت ہو کر راہی ملک عدم گیا ہوگا تو دوسرے لوگوں کی حسرتوں کی طرح کی کوئی حسرت ساتھ لیے نہیں گیا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بے وفا

دنیا میں رہتے ہوئے ایسا ہونا عملاً ممکن نہیں اور چاہتے نہ چاہتے ہماری حسرتیں رہ ہی جاتی ہیں۔

اسی طرح ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو عمر بھر سفر میں رہتے ہیں مگر وہ کبھی کسی منزل تک نہیں پہنچ پاتے اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انہیں ساری زندگی عرفان ذات ہو ہی نہیں پاتا، وہ کس کام کے لیے بنے ہیں اور وہ اپنی ساری زندگی کن کاموں کی نظر کر کے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس لیے نہ تو ان کا دنیا میں آنا کوئی تاریخ ہوتا ہے نہ ہی دنیا سے جانا کوئی تاریخی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

کامران بٹ اس حوالے سے بھی دوسروں سے منفرد رہا کہ اسے عرفان ذات کا ادراک اپنی اولین زندگی میں ہی ہو گیا تھا جس کا اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ جب کالج میں تھا تب بھی اپنے ہم جولیوں میں منفرد تھا، جب طلبہ سیاست اور عملی سیاست میں قدم رکھا تب بھی اپنے ہم عصروں میں جدا رہا۔ عملی زندگی میں آیا تو وہاں بھی اپنی خاندانی روایتی ساخت کے برعکس الگ تھلگ رہا۔ دیارِ غیر میں بھی محض تارکین وطن کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی بجائے خود کو نمایاں رکھا اور عملی سیاست کے ذریعے ہر موقع پر خود کو نمایاں رکھا۔ جب جب رخصت پر گھر آیا تو اس کے کروفر اور شان وشوکت سے یہ اندازہ ہو جاتا کہ کوئی رخصت پر کافی عرصہ کے بعد واپس گھر آیا ہے۔ وہ جتنا وجیہہ تھا اتنا ہی وجاہت پسند بھی، جیسا بزلہ سنج تھا ایسا ہی بزلہ شناس بھی۔ اپنے ہم مزاج دوستوں کو ڈھونڈ لینا اسے خوب آتا تھا۔ اسی طرح اسے باتوں کو دل میں دبا لینے کی بجائے اظہار کرنا زیادہ پسند تھا۔

جو بھی دنیا میں آتا ہے اُس نے ایک نا ایک دن اس دنیا سے اپنا کردار ادا کر کے رخصت ہونا ہوتا ہے۔ یہ کاتبِ تقدیر کا ازل سے فیصلہ ہے اور ابد تک یوں ہی رہے گا۔ وہ جب کسی کو دنیا میں بھیجتا ہے تو اُس کو اس کے خاص کردار سے الگ کر دیتا ہے۔ اب یہ اس کردار پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اس کردار کو ادا کرتے ہوئے اس میں حقیقت کے کتنے رنگ بھرتا ہے۔ کامران بٹ کو اُس کی زندگی میں جو کردار ملا اُس نے اس کو بہت خوبصورتی سے نبھایا۔ وہ خوش جمال وخوش خصال ہی نہیں تھا قدرت نے اُس میں اور بھی بہت سے اوصاف رکھے تھے وہ جن سے وہ ہر ایک کا ہر دلعزیز تھا۔ اس نے اپنی شخصیت اور اپنے کردار کا لوہا اس طرح سے منایا کہ اپنے بیگانے سب کو اپنا گرویدہ کیا اور جب اپنے کردار کی تکمیل کر کے اس ذیست کی کہانی سے الگ ہوا تو بھی

اپنے پیچھے ایک داستان چھوڑ گیا۔

یہاں پر کون ایسا تھا جو اس کے چلے جانے سے مغموم نہیں ہوا، کون ایسا تھا جس نے اُس کی جدائی کے درد کو محسوس نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے پرائے سب نے اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ اس نے اپنی انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعیت سے گریز نہیں کیا۔ اس ریاست کی آزادی کے خواب کو پورا کرنے کے لیے مقدور بھر اپنا کردار ادا کیا۔ مہذب دنیا کے ایوانوں میں کشمیریت کی بات کی، کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی آواز اُٹھائی۔ آزادی کے خواب کو پورا کرنے کے لیے ''مشن کشمیر ٹاسک فورس'' تشکیل دیا۔ اپنے بیگانے سب کو اپنا ہم آواز کیا جس کا جیتا جاگتا ثبوت آج کا سارا باغ ہے۔ سب کو اس کی جدائی کا دکھ ضرور ہے مگر اس بات پر فخر بھی ہے کہ اُس نے خواب تحریک آزادی کو اجالنے کے لیے یہاں سے دور دیار غیر میں رہتے ہوئے بھی اپنی جدوجہد جاری رکھی دوست احباب کو جوڑا۔ کشمیریوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی اور اسی جدوجہد میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے اور وہ بڑے سے بڑے زخم کو بھی بھر دیتا ہے۔ اس کی جدائی کے زخم وقت کے ساتھ بھرتے چلے جائیں گے۔ اس سے وابستہ ہر رشتہ کسی نہ کسی متبادل یاد کے ساتھ منسلک ہو کر پھر سے سفر حیات میں آگے بڑھتا رہے گا۔ مگر اُس کا خلا ہمیشہ قائم رہے گا، اس کے پیاروں کو اُس کی یاد دلاتا رہے گا اور اُن کے دلوں میں ایک کسک بن کر ہمیشہ زندہ رہے گا

☆☆☆

پپی شوقی بٹیرا

ہم میں سے کون ایسا ہے جو خود پر ہنس سکتا ہے، جو اپنے مضحکہ خیز نام رکھ کر دوسروں کو بتائے اور اُن کو خود پر ہنسنے کا موقع دے۔ یقیناً یہ کہنا بہت آسان ہے مگر اس کو سہنا بہت مشکل...... عموماً گاؤں دیہات میں کوئی شخص اپنے اصل نام کی بجائے جب اپنی کسی حرکت کے باعث کسی عرف یا ایسے مضحکہ خیز نام سے مشہور ہو جائے تو وہ نام اس کے احساسات کے حوالے سے کس طرح کا ہو سکتا ہے اور اگر اس عرف سے اس کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو تو یہ کہنے والا بتا سکتا ہے یا سہنے والا کہ اس سے اس کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ بحثیت قوم ہمارا محبوب مشغلہ دوسروں کی کمیوں اور خامیوں پر ہنسنا اور خوش ہونا اور سب سے بڑا دکھ جب کوئی ہماری تحقیر کر رہا ہو اور ہم پر ہنس رہا ہو۔

ان سب باتوں کے باوجود ایک ایسا شخص جو خود اپنے عجیب وغریب نام رکھے پھر اسے اپنے دوستوں کو بتائے اور جب اس کے دوست اس کے ان ناموں میں سے کسی نام سے اس کا تمسخر اُڑائیں، اس پر جگتیں کسیں اور اس پر ہنسیں اور وہ بھی دوستوں کے ساتھ مل کر اس نام کی مناسبت سے قہقہے لگا رہا ہو تو یقیناً یہ شخص ابرار یونس ہی ہو سکتا ہے۔ درمیانی قد وقامت، بھاری جسم رنگ گندمی جس میں سرمئی کی جھلک نمایاں اور بقول یونس بٹ کے کہ اگر وہ نہا کر واپس آ رہا ہو تو یوں لگتا ہے کہ جیسے ابھی نہانے کے لیے جا رہا ہے عموماً ایک ہی طرح کی لٹکی ہوئی جینز و جوتے اور باہر نکلا ہوا پیٹ اور اس پر آگے کی جانب نکلی ہوئی شرٹ اور سردیوں میں اس پر اوور کوٹ میں آنکھوں پر موٹا سا چشمہ سجائے اور کانوں کے ساتھ موبائل لگائے سڑک کے کنارے چلتے ہوئے جو شخص دکھائی دے گا وہ یہی ابرار یونس ہی ہو سکتا ہے۔

پومی، پپی، ماموں، پپی شوقی بٹیرا، خوب صورت، کالا اور جانے کیا کیا نام ہیں جو کسی نے اسے نہیں دیے بلکہ اس نے خود تراش خراش کر کے دوستوں کو دیے ہیں کہ میں نے اپنا نام ابرار یونس سے تبدیل کر کے

پپی شوقی بٹیرا رکھ لیا ہے لہذا مجھے اسی نام سے لکھا اور پکارا جائے ۔یوں وہ نام دوستوں کے تمام حلقے میں معروف ہو جائے اور اسے اسی نام سے چھیڑا جا رہا ہو۔ابھی اس نام کی شہرت ماند بھی نہ پڑی ہوا اور ایک اور نیا نام منظر عام پر آ جائے ۔یہی صورت حال اس کے ساتھ بیٹھنے والوں کی بھی ہے جن کو وہ مختلف ناموں اور القابات سے وقتاً فوقتاً نوازتا رہتا ہے ۔ناموں کی یہ تبدیلی اس کی اپنی ذات اور دوستوں کی حد تک نہیں بلکہ جس کاروبار کے ساتھ وہ منسلک ہے اس کے بھی تھوڑے عرصہ کے بعد نام تبدیل کر کے ایک نئے نام کے ساتھ مارکیٹ میں موجود ہونا ایسا ہر کوئی نہیں کر سکتا ہے اور جو کر سکتا ہے وہ صرف ابرار یونس ہی ہو سکتا ہے ۔ ہمار اخیال تو یہ ہے کہ اتنی شاید گاندھی نے دھوتیاں نہیں تبدیل کی ہوں گی جتنے ابرار یونس نے نام تبدیل کئے ہوں گے۔

گاندھی سے یاد آیا کہ ابرار یونس کا تعلق جس سرزمین سے ہے وہ تقسیم برصغیر سے پہلے ''گوپال پور'' کے نام سے موسوم تھی جو کہ گاوَپال پور کی بگڑی ہوئی شکل تھی ۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہاں سے کشمیری راہنما چودھری غلام عباس کا گزر ہوا اور یوں ان کی برکت سے گوپال پور عباس پور کے نام سے موسوم ہو گیا۔ ہم برصغیر والوں کے اسلام کا بھی اپنا نرالہ رنگ ڈھنگ ہے ہم نے برصغیر میں رہتے ہوئے اتنے ہندوؤں کو مسلمان نہیں کیا ہو گا جتنا ہم نے غیر مسلم شہروں ،قصبوں اور دیہات کو مسلمان کیا ہے ۔ یقیناً ہمارے پُرکھوں کے ذہن میں ان علاقوں کو مسلمان کرنے کی بھی توجیح موجود ہو گی تبھی ہمارے غیر مسلم علاقے مسلمان ہو کر اسلام گڑھ ،اسلام پور ،اسلام نگر ،اسلام آباد اور جانے کن کن اسلامی ناموں سے موسوم ہوئے ۔اس طرح ممکن ہے بغیر کسی مشقت کے صرف علاقے کا نام تبدیل کرنے سے ساری آبادی مسلمان ہو گئی ہو۔

اب تو ناموں کی تبدیلی کی یہ رسم اتنی عام ہو گئی ہے کہ کوئی ادارہ ،کوئی پل ،کوئی سڑک ،کوئی گلی ،محلّہ غرض کس کس کا نام لیا جائے جس کو ہم نے کسی نہ کسی نام سے موسوم نہ کیا ہو۔ستم ظریفی کی حد تو یہ ہے کہ ہم ان شخصیات کے ساتھ ان جگہوں کو منسوب کر دیتے ہیں جن کا دور دور تک اس ادارے یا اس شعبے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ دوڑ اب اتنی عام ہو گئی ہے کہ ادھر گھر میں کوئی مرا ادھر وہ دوڑ کر مرحوم کے نام کا نوٹیفکیشن کرانے جا پہنچتے ہیں یا پھر تعزیت پر آنے والا کوئی سیاستدان مرحوم کے ورثاء کو تسلی دے رہا ہوتا ہے کہ مرحوم کی نادیدہ

خدمات کے پیشِ نظر اس کے نام سے ہم فلاں ادارہ منسوب کریں گے۔ اس معاملہ میں بعض اوقات یہ صورت حال اتنی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے کہ ایک ہی جگہ کو کبھی ایک نام سے منسوب کرنے کا نوٹیفکیشن جاری ہوتا ہے تو اگلی بار اگلے مرحوم کے نام سے۔ یوں ایک طرف ایک مرحوم کے ورثا کی دوڑیں لگ جاتی ہیں تو دوسری طرف دوسرے مرحوم کے ورثا کی ....اب ذرا کوئی ان سے یہ پوچھے کہ آپ جس نام کی نسبت سے اس سڑک، ادارے یا کسی مخصوص جگہ کا نام اس شخصیت سے موسوم کرنا چاہتے ہیں مرحوم کی اس کی نسبت خدمات کیا ہیں؟ کیا مجال کسی میں جو کسی سے یہ پوچھ سکے کہ اس کی کن خدمات کے پیشِ نظر متعلقہ جگہ یا ادارہ اس کے نام سے منسوب کیا جا رہا ہے اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس طرح کر کے مرحوم کے ورثا کب تک اپنے پرکھوں کا نام زندہ رکھ پائیں گے۔

جہاں تک ابرار یونس کا تعلق ہے تو مجھے یقین ہے کہ اس کے پُرکھوں نے گوپال پور آمد سے قبل ہی اسلام قبول کر لیا ہو گا۔ علامہ اقبال نے ''پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے'' جیسی شہرہ آفاق نظم میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب پہلے منگول نے اسلام قبول کیا تھا۔ لہٰذا برصغیر تک پہنچتے اور پھر وہاں سے ابرار یونس تک آتے آتے ان کی ساری نسلیں یقیناً اسلام کی کرنوں سے منور ہوتی آئی ہوں گی۔ رہی بات ابرار یونس کے اسلام کی تو اس کو ہم نے اسے کبھی ٹھاٹھ کا نمازی دیکھا ہے، کبھی آٹھ کا اور کبھی تین سو ساٹھ کا............

ہم نے ابرار یونس کو کلین شیو بھی دیکھا ہے اور ڈاڑھی میں بھی، بال اور ڈاڑھی ڈائی کئے ہوئے بھی دیکھا ہے اور بڈھے جوان کی حالت میں بھی...... وہ کوئی بھی کام زیادہ عرصہ تک کرنے کا عادی نہیں ہے اس لیے جس طرح سانپ کینچلی بدلتا ہے ابرار یونس اپنا رنگ ڈھنگ بدلتا رہتا ہے۔ جی چاہا تو شیو بڑھالی، جی چاہا تو ڈاڑھی رکھ لی اور پھر جی چاہا تو کلین شیو ہو گئے۔ اگر اس طرح بھی کام نہ چلا تو کبھی جا کر کراچی کا ہو رہا تو کبھی راولپنڈی کا اور اگر یہاں سے بھی بچ جائے تو پھر عباسپور کی طرف عازمِ سفر ہونا تو کوئی بات ہی نہیں............

اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ اس کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے تو ہمارا جواب ہو گا کہ ابرار یونس وہ مرکزہ ہے جس کے گرد ہمارا حلقہ احباب گردش کرتا ہے۔ یہ ہمارے دوستوں کے سولر سسٹم کا وہ مرکزی سورج ہے جو جب نہیں ہوتا تب ہی اس کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور جب موجود ہو تو سارے اس کے آس پاس جمع ہو

جاتے ہیں اور یوں ''لوگ ساتھ آتے گئے اور کارِرواں بنتا گیا۔''

اس کو سب سے زیادہ خوشی تب مل رہی ہوتی ہے جب وہ دوستوں کے لیے کسی ضیافت کا اہتمام کر رہا ہوتا ہے۔اس کا محبوب مشغلہ یہ ہے کہ جب اس کے اہل خانہ گھر نہ ہوں تو تمام دوستوں کو گھر بلا کر اپنے ہاتھ سے ایک ایک ڈش تیار کر کے سب کو پیش کرنا اور خود نام کا کچھ ذرا سا کھانا......وہ پیٹو نہیں ہے نہ ہی اسے زیادہ کھانے کا شوق ہے،البتہ اس کے دسترخوان پر بہت سے دوست جمع ہوں اور وہ ان کو آگے بڑھ کر انواع و اقسام کے کھانے پیش کر رہا ہو۔کبھی تو ابراری حلوہ،کبھی ابراری چائے و کافی اور کبھی ابراری کھیر اس کی محفل میں چل رہی ہوتی ہے۔

جب بھی اس کے کاروباری مرکز پر آئیں کسی نہ کسی دوست کے ساتھ بیٹھا ہوا الیکٹرک کیتلی میں خود ہی چائے بنا بنا کر سب کو تقسیم کرنے والا ابرار یونس ہی ہے۔ان بیٹھنے والوں میں کہیں تو شہباز گردیزی ہے تو کہیں ڈاکٹر سمیع، کہیں سردار شعیب ہے تو کہیں ڈاکٹر ریاض عباسی، کہیں زبیر حسین زبیری ہے تو کہیں سید مشتاق بخاری، کہیں شیخ شبیر ہے تو کہیں فاروق خان، کہیں ممتاز کاظمی ہے تو کہیں قیوم خان، کہیں ڈاکٹر کمیل قزلباش ہے تو کہیں ڈاکٹر اسرار و ڈاکٹر طارق، کہیں ڈاکٹر تسکین اقبال ہے تو کہیں مقصود خان و اظہر شاہ، کہیں شفیق عباسی ہے تو کہیں محمد علی، امجد گردیزی اور احمد فرہاد علی ھذا القیاس۔۔۔۔کس کس کا نام لوں کس کا چھوڑ دوں۔یہ سارے کبھی تو ابرار یونس کے خانہ ابرار پر اس کے آس پاس براجمان ہیں تو کبھی مل کر گنگا چوٹی لس ڈنہ یا کسی اور جگہ کا پروگرام بن رہا ہے۔کوئی لکڑیاں جمع کر رہا ہے تو کوئی پانی لا رہا ہے،کوئی بیٹھنے کے لیے جگہ بنا رہا ہے تو کوئی چولہا جلا رہا ہے۔کہیں کوئی لطیفہ گوئی ہو رہی ہے تو کہیں کوئی گنگنا رہا ہے۔

ہم جب نئے لوگوں سے ملتے ہیں تو ایک دم ان پر نہیں کھلتے یوں ہمارے درمیان ایک خاص تکلف کافی عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ابرار یونس اس کا بالکل اُلٹ ہے وہ پہلی ملاقات میں ہی دوسروں کو کھولنے اور ان کے ساتھ گھل مل جانے کا ہنر رکھتا ہے کہ بڑے سے بڑے رتبے اور عہدے کا حامل شخص بھی ابرار یونس کا لنگوٹیا لگتا ہے اور ابرار یونس اس کو کسی ''نِک نیم'' سے پکار رہا ہوتا ہے۔اس وجہ سے اس کے حلقہ احباب میں چھوٹی سے چھوٹی عمر سے لے کر بڑے بڑے بابوں تک سب نظر آتے ہیں۔اپنے کاروباری مرکز پر آنے

والے مردوزن کو وہ اتنی بے تکلفی اور اتنی اپنائیت سے مخاطب کرتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں ہی اس کو اپنا محرم وہم راز سمجھ بیٹھتے ہیں۔

اسی طرح اس کے کام میں ایک خاص تسلسل ہے، جب اس نے باغ میں کاروبار کا آغاز کیا تو محض چند ہزار روپے سے شروعات تھیں مگر آج جب وہ ایک سے زائد شعبہ جات میں بھر پور تجارتی مہارت کے ساتھ آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے تو یہ اس کی پیشہ وارانہ خوبی ہے جو اسے دوسروں میں ممتاز کرتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو آج باغ میں بلاشبہ بڑے کاروباری حضرات میں شمار ہوتا ہے اس کا یہ سارا تجارتی سفر باغ سے شروع ہو کر یہیں پر ختم ہوتا ہے۔ وہ کیسے پیسے کا لین دین کر رہا ہوتا ہے اس کا شاید خود اس کو بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات لین دین کے ان معاملات میں اسے شدید ذہنی دباؤ کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس معاملے میں بھی وہ اتنا مین آف سٹیل ہے کہ کیا مجال وہ کسی بڑے سے بڑی بات یا کسی کی تنقید اور ناراضی کی پرواہ کرے۔ نتیجتاً وہ اس طرح کے کئی مالیاتی بھنور بھی آسانی سے عبور کر لیتا ہے جن میں اگر ہم میں سے کوئی بھی اگر پھنسے اور دھنسے تو پھر دھنستا ہی چلا جائے۔

پیسہ کہاں سے آ رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے اس کا ابرار یونس کو خود بھی پتہ نہیں ہوتا۔ ایک شعبہ سے حاصل ہونے والی آمدن کسی اور شعبہ کی طرف جا رہی ہے۔ دوسرے سے آنے والی کسی اور مد میں خرچ ہو رہی ہے اور تیسرے شعبہ سے آنے والی آمدن کا مصرف کچھ اور......اس ساری مشق سخن کی وجہ سے اسے شدید مالیاتی مسائل بھی پیش آتے ہیں مگر وہ کسی بھی بات کی پرواہ نہیں کرتا تبھی وہ لین دین کے معاملات میں اکثر متنازعہ ہو رہا ہوتا ہے۔ لیکن اسے اس سے کوئی سروکار نہیں کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔

ذرا سوچیں ایک چھت کے نیچے ایک وقت میں کوئی کتنے کام کر سکتا ہے مگر ابرار یونس ہے کہ وہ ایک وقت میں کئی کئی کام چلا رہا ہوتا ہے۔ ایک طرف سٹیشنری فروخت ہو رہی ہے تو دوسری طرف کتابیں اور یونیفارم فروخت ہو رہے ہیں۔ ایک حصے میں کمپیوٹر اور پرنٹرز کی مرمت ہو رہی ہے اور انہیں مختلف مریضوں کی طرح detain اور داخل کر کے ان کی بحالی کے لیے کوششیں جاری ہیں تو الگ ایک اور حصے میں ہارڈ ویئر کی شکل میں رنگ و روغن فروخت ہو رہے ہیں، رنگ سازوں کی ٹیمیں وقفے وقفے سے اس کی دکان میں داخل

ہوتی ہیں اپنے اپنے متعلقہ کام ذمہ لیتی ہیں اور روانہ ہو جاتی ہیں اور ایک طرف کاونٹر پر بیٹھا ابرار یونس لگا تار فون پر اپنے آن لائن کاموں کو ترتیب دیتا دکھائی دیتا ہے۔ان سارے کاموں کے ساتھ ساتھ کوئی ایک وقت بھی ایسا آپ کو نظر نہیں آئے گا جب اس کے آس پاس اس کے دوستوں میں سے کوئی دو چار لوگ نہ بیٹھے ہوں ۔بلکہ یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ وہ کاروبار کے ساتھ دوستی چلا رہا ہوتا ہے تو دوستی کے ساتھ کاروبار۔نہ دوستی کاروبار کے آڑے آتی ہے اور نہ کاروبار دوستی کے............

ابرار یونس کا دوست کون ہے یہ بتانا مشکل ہے اور کون دوست نہیں ہے یہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔وہ سب کا دوست ہے،اس کے حلقہ یاراں میں ہر عمر، رنگ، نسل اور جنس کے احباب ہیں، چھوٹے سے لے کر بڑے تک اور بڈھوں سے لے کر جوان تک۔اسی لیے وہ اپنا حلیہ بھی ایسا رکھتا ہے تا کہ آسانی سے ہر عمر و جنس کے لوگوں کے ساتھ منسلک ہو سکے۔ اسے لوگوں کو کھولنا خوب آتا ہے،لوگوں کو بغیر محسوس کرائے گھل مل جانا آتا ہے۔

ہر انسان میں ایک بچہ ہوتا ہے جسے ڈھونڈ نا اور اس کو کھلکھلانا اسے خوب آتا ہے۔عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جوں جوں ہم بڑے ہوتے جاتے ہیں وہ بچہ اندر ہی کہیں گھٹ کر دم توڑ دیتا ہے اور کوئی اسے ڈھونڈ نہیں سکتا ۔یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک زندگی کے ان لطیف احساسات سے محروم ہے جو اس کے لیے خوشی، راحت اور جینے کا باعث ہیں۔آپ لوگوں سے ملیں ان کے ساتھ کچھ وقت گزاریں آپ کو احساس ہوگا کہ آپ کے ساتھ چلنے والا شخص اپنے اندر کتنی گھٹن لیے ہوئے ہے،اسے شاید آخری بار ہنسے ہوئے زمانہ بیت گیا ہو اور وہ اپنی ذات کے لیے بھی اجنبی ہو چکا ہو۔

ایک ہسٹریائی کیفیت ہے جو ہر ایک پر طاری ہے،ایک خاص ڈپریشن ہے جس کا ہم میں سے ہر کوئی شکار ہے مگر ہم میں سے کسی کو بھی اس کا ادراک نہیں۔ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے جس نے ہم میں سے ہر ایک اپنی گرفت میں لے رکھا ہے مگر اس کا ادراک کرنے کی بجائے ہم دوسروں کو نفسیاتی اور سائیکو سمجھتے ہیں۔اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں مگر اہم وجوہات میں کام کی زیادتی، جائے کام پر افسران بالا کا تحکمانہ رویہ، غیر مساویانہ روزگار کے مواقع، اقربا پروری، گھریلو ناآسودہ حالات، بے جوڑ شادیاں، گھریلو غیر صحت مند

ماحول، جبر وتشدد اور دوسروں سے آگے نکلنے کی وہ دوڑ جو ایک طرف تعلیمی اداروں میں زیادہ نمبرات کی صورت میں دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف معاشرتی سطح پر دوسروں کم تر دکھانے کے لیے اپنی بساط سے بڑھ کر خواہشات کا بوجھ۔ یہ ساری وجوہات مل کر جہاں ایک طرف انسان کو وقت سے پہلے بوڑھا کر رہی ہیں تو دوسری طرف اسے ذہنی تناؤ، ڈپریشن اور طرح طرح کے دماغی عارضوں میں مبتلا کرتی ہیں۔

ان وجوہات کا شکار ہو کر نتیجتاً ہم خود سے بات نہیں کرتے، ہم اپنی ذات میں تنہا ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ہم خود کو جانتے تک نہیں، ہم اپنے لیے اجنبی بن کر رہ جاتے ہیں محض ایک کمانے والی مشین جیسے بقول شہباز گردیزی

مجھ کو لگتا ہے کہ گھر میں مجھے گھر والوں نے
ایک مزدور کمانے کے لیے رکھا ہے

ہم میں سے ہر ایک چاہے وہ بڑے سے بڑے عہدے پر متمکن ہو چاہے کوئی ریڑھی بان یا دیہاڑی دار، ہم مزدور ہی تو ہیں گھر والوں کی ضروریات کے، اپنے بچوں کی خواہشات کے اور ان کے جنھوں نے ہمیں اُجرت پر رکھا ہوا ہے۔ اس گھٹن زدہ ماحول میں ابرار یونس جیسے دوست اگر کسی کے پاس ہوں جو اسے اس بچے سے متعارف کرائیں جو فکر روزی میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ جو ہمارے اُوپر چڑھا ہوا عہدے، رتبے، قبیلے یا کسی جاہ و منصب کا خول اتار کر ہمیں خود سے ملوا دیں تو سوچیں اس کا وجود اس معاشرے کے لیے کتنا غنیمت ہو گا۔ انشاء نے کہا تھا

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

☆☆☆

مصنف کی دیگر کتب

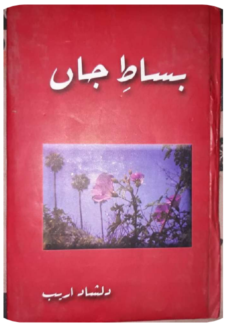

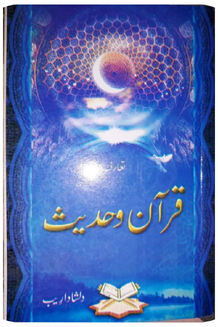

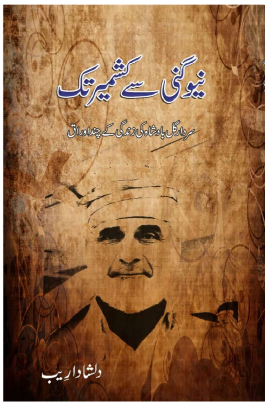

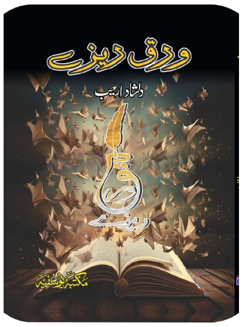

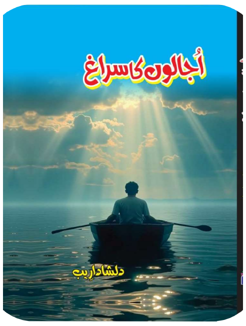

"اُجالوں کا سُراغ" دلشاد اریب کی شخصی خاکوں پر مبنی کتاب ہے۔ اس سے قبل آپ کی چار کتب شائع ہو کر مقبولِ عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ آپ شاعر، استاد، محقق، ادبی نقاد اور کالم نگار ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات لائق صد تحسین ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا

مَیں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کا سُراغ

یہ اُجالوں کا سراغ ہو یا آتش رفتہ کا سُراغ اصل میں یہ مرزا غالب کا طلسم گنجینہ معانی ہے جب وہ کہتے ہیں

گنجینۂ معانی کا طلسم اِسے سمجھیے
جو لفظ بھی غالب میرے اشعار میں آوئے

دلشاد اریب کے اِن خاکوں میں جو بھی لفظ آیا ہے وہ اُس شخصیت کا اختصار کے ساتھ فطری اور حقیقی نقشہ ہے جس کا مبالغہ آرائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ نے کتاب کی تمہید میں خاکہ نگاری کی تاریخ کو جس تفصیل سے بیان کیا ہے اور اِس میں انگریزی اور اُردو ادب کے قدیم اور جدید خاکہ نگاروں کا جس ترتیب سے تذکرہ کیا ہے وہ اُن کے وسیع مطالعے کا غماز ہے۔ یہ کتاب گُلدستہ گلہائے صد رنگ ہے۔ اس میں مذہبی، علمی، ادبی اور سماجی شخصیات کے خاکے ہیں جو نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ میری جنم بھومی پونچھ میں علم و ادب کے چراغ روشن ہیں اور وہ آج بھی شب تیرہ و تاریک میں اُجالوں کا سُراغ لگانے میں مشغول ہیں۔ اِن چراغوں میں ایک چراغ دلشاد اریب ہے۔

ڈاکٹر مقصود جعفری
۱۶ ستمبر ۲۰۲۵
اسلام آباد

مکتبہ یوسفیہ
ایوب پرنٹنگ پریس نزد گورنمنٹ آئی ہسپتال داتا دربار لاہور
+92-300-8124958 + 92-323-4792670